جاپان میں پانچ سال
ڈاکٹر عبدالحق
私は日本での

جاپان میں پانچ سال

ڈاکٹر عبدالحق

جاپان میں پانچ سال

ڈاکٹر عبدالحق

رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

اہلیہ ڈاکٹر صالحہ خانم اور بیٹیوں ڈاکٹر اسما اور ڈاکٹر حنا

کے نام

جن کے ایثار کے بغیر یہ قیام ممکن نہ تھا

علاوہ ازیں

پروفیسر ڈاکٹر تبسم کاشمیری

اور

پروفیسر ڈاکٹر نعیم رشید

کا بہت شکریہ

جنہوں نے قیام جاپان کے دوران میرے لئے بہت آسانیاں پیدا کیں

فہرست

پیش لفظ

میں اس سے پہلے تین کتابیں لکھ چکا ہوں۔ ایک شاعری کی کتاب 'کلامِ سادہ' اور دو سفرنامے 'میں حاضر ہوں' اور 'اڑن کھٹولا'۔

یہ کتاب 'جاپان میں پانچ سال' سفرنامہ نہیں مگر سفرنامہ بھی ہے۔

میری اب تک لکھی گئی سب نثری کتب کا بنیادی مقصد ایک ہی ہے۔ اپنی زندگی کے کچھ بکھرے اوراق کو اپنے لئے اور آنے والی نسلوں کے لئے اکٹھا کرنا تاکہ وہ ریکارڈ کا حصہ بن جائیں۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ قارئین کو دلچسپ اور مفید معلومات فراہم کی جائیں۔

اس دفعہ میں نے والدِ محترم ڈاکٹر عبدالحمید صاحب کی سوانح عمری لکھنے کا سوچا تھا، مگر ان کی ابتدائی زندگی کے بارے میں معلومات کا حصول مشکل ہو رہا ہے جس کی وجہ سے یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ جن لوگوں کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ان میں وہ سب سے عظیم شخصیت تھے۔

میری پچھلی کتاب 'اُڑن کھٹولا' جو غیر ملکی سفرناموں پر مشتمل ہے، کافی مقبول ہوئی۔ جناب مستنصر حسین تارڑ اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری جیسی عظیم شخصیات نے اسے پسند فرمایا۔ اس کے علاوہ جنگ اور ڈان جیسے بڑے اخباروں میں اس پر توصیفی تبصرے بھی لکھے گئے۔ مگر کئی دوستوں کی طرف سے جن میں میرے جاپان کے زمانے کے دوست پروفیسر نعیم رشید سرفہرست ہیں، اس سوال کا سامنا کرنا پڑا کہ میں جاپان میں پانچ سال رہا، اس کا ذکر کیوں نہیں؟

جاپان کے قیام کے بارے میں لکھنے کی راہ میں دو بظاہر نا قابل عبور رکاوٹیں تھیں۔
ایک تو یہ کہ بیس پچیس سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور دوسری یہ کہ سوائے تصویروں کے میرے پاس کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔

ذہن میں یہ سوال بھی اٹھا کہ بیس پچیس سال پرانے جاپان میں آج کے قاری کے لئے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔اس کا جواب فوراً مل گیا۔اگر موبائل فون، انٹرنیٹ اور ڈیجیٹل کیمرے کو نکال دیں تو جاپان اب بھی ویسا ہی ہے جیسا بیس بائیس سال پہلے تھا۔وجہ یہ ہے کہ وہ اس وقت ہی ترقی کی معراج تک پہنچ چکا تھا۔جو چیزیں کئی ترقی یافتہ ممالک میں آج نظر آتی ہیں، جاپان میں اس وقت بھی موجود تھیں۔

جس کام کو میں ناممکن سمجھتا تھا اسے کرنے کی کچھ امید پیدا تو ہوگئی تھی مگر چند تصویروں کی مدد سے ایک کتاب تو نہیں لکھی جا سکتی تھی۔

میں نے اپنے ذہن کو اس طرف مائل کیا۔جو چیز یاد آتی وہ لکھ لیتا۔تین چار مہینے بعد میں نے محسوس کیا کہ اتنا کچھ یاد آ گیا ہے کہ کتاب لکھنے کا ارادہ کیا جا سکتا ہے۔

پچھلے ایک سال میں جب میں یہ کتاب لکھ رہا تھا، کئی اور واقعات یاد آتے گئے اور میں لکھے ہوئے میں ترمیم و اضافہ کرتا رہا۔اب میں مطمئن ہوں کہ جو میں چاہتا تھا، میں نے وہ نتیجہ حاصل کر لیا۔

اپنی کہانی شروع کرنے سے پہلے میں نے جاپان پر ایک تعارفی نوٹ لکھا ہے۔اس میں وہ معلومات ہیں جنہیں کہانی کی لڑی میں پرونا مشکل تھا۔

میں نے ہلکے پھلکے انداز میں معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔اتنا اختصار بھی نہیں کہ تشنگی محسوس ہو اور اتنی تفصیل بھی نہیں کہ تحقیقی مقالہ لگے۔

میرے جاپان میں قیام کے دو ادوار ہیں۔اسی مناسبت سے میری کہانی کے دو حصے ہیں۔پہلے حصے میں تین باب ہیں اور دوسرے میں دو۔

مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کو بہت دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

میں جناب پروفیسر ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا بہت ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود وقت نکالا اور اس کتاب پر 'چند باتیں' کے عنوان سے ایک جامع اور مفصل

تبصرہ لکھا۔

پروفیسر ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اردو ادب میں ان کا بڑا مقام ہے۔ اس کے علاوہ اردو زبان کی تدریس میں ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ انہوں نے ۲۵ سال جاپان میں اردو کی ترویج کی نذر کردیے۔ اس دوران انہوں نے اُردو جاپان ڈکشنری کی تیاری میں ایک کلیدی کردار ادا کیا۔ ان کی کاوشوں کے اعتراف میں جاپانی شہنشاہ نے انہیں شاہی محل میں مہمان کے طور پر مدعو کیا۔

میرے جاپان کے قیام کے دوران وہ ہمیشہ میرے رہنما اور دوست رہے۔ اس پس منظر کے ساتھ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کتاب پر تبصرہ لکھنے کے لئے وہ موزوں ترین شخصیت ہیں۔

●●●

چند باتیں

اُردو کا پہلا سفرنامہ یوسف خان کمبل پوش کا 'عجائبات فرنگ' تھا جو ۱۸۴۹ عیسوی میں شائع ہوا تھا۔اس کے بعد سفرنامے لکھے جاتے رہے مگر ان کی رفتار سست تھی۔ جدید اردو سفرنامہ کا آغاز 'نظر نامہ' سے ہوتا ہے۔ یہ محمود نظامی کا شاہکار تھا جو ۱۹۵۲ عیسوی میں شائع ہوا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اس سفرنامے کی اشاعت سے اردو سفرنامہ کی دنیا میں ایک انقلاب آیا۔ اردو سفرنامہ اپنی کمزور روایت سے باہر نکلا۔ محمود نظامی کے فن نے پہلی بار سفرنامہ کی تکنیک میں متخیلہ، فکشن، اور لاشعور کی رو کو متعارف کرایا۔ اس اعتبار سے 'بازار مصر' اردو کا پہلا جدید سفرنامہ تھا جس سے ایک breakthrough ہوا۔ اس جدید روایت کا بہترین استعمال اختر ریاض الدین نے کیا۔ 'سات سمندر پار' اور 'دھنک پر قدم' جدید سفرنامے کو مزید وسعت دینے والے مجموعے تھے۔ اس کے بعد مستنصر حسین تارڑ کے سفرناموں کا دور ۱۹۷۰ عیسوی کی دہائی سے شروع ہوا اور اردو سفرنامہ اپنے عروج تک پہنچا۔ مستنصر حسین تارڑ اردو سفرنامہ میں مینارہ نور کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد اب میں ذکر کروں گا ڈاکٹر عبدالحق کے سفرنامے کا جو 'جاپان میں پانچ سال' کے قیام پر مشتمل ہے۔ جاپان پر دور جدید میں جو مختصر سفرنامے لکھے گئے ہیں ان میں اختر ریاض الدین اور ابنِ انشا کے سفرنامے بہت مقبول ہوئے ہیں۔ اور اب جاپان پر ڈاکٹر عبدالحق کا سفرنامہ شائع ہو رہا ہے جو تقریباً سوا دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اکیسویں صدی میں جاپان پہ لکھا جانے والا یہ پہلا مفصل سفرنامہ ہے جو جدید سفرنامے کی دنیا میں ایک قابلِ قدر اضافے کی

حیثیت رکھتا ہے۔

عبدالحق اپنے پیشے کے اعتبار سے سائنسدان ہے۔ تجربہ گاہوں میں بیٹھنے والا انسان ۔۔۔مگر یہ شخص تجربہ گاہوں کی نذر نہیں ہوا۔اس نے اوساکا میں قیام کے دوران میں اپنے پانچ برس تجربہ گاہوں میں بیٹھے ہوئے عمیق سائنسی مشاہدات و تجربات میں تو بسر کئے تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کی خوش طبعی، زندہ دلی اور دنیا کو دیکھنے کی خواہش نے اسے تجربہ گاہوں سے باہر نکلنے پر مجبور کیا۔اسے اپنے علمی ماحول سے جب جب فرصت ملی وہ جاپانی زندگی، معاشرت، تہذیب و ثقافت اور تفریح گاہوں کے بھی چکر لگاتا رہا۔اس نے جو کچھ دیکھا وہ اپنے سینے میں محفوظ کر لیا اور اب ایک طویل مدت بعد اس کا قلم حرکت میں آیا ہے اور اس نے اپنی خوبصورت یادیں اور نہایت دلچسپ مشاہدات کاغذ پر اتار دیے ہیں۔ یہ نہایت دلچسپ سفر نامہ ہے جس میں مصنف نے جاپان میں رہتے جو کچھ اس کے مشاہدے میں آیا اسے بہت خوش گوار اسلوب میں قلم بند کر دیا ہے۔

جب میں نے اس سفرنامے کو پڑھنا شروع کیا تو میرا خیال تھا کہ عبدالحق تو سائنس دان ہے وہ سفرنامے میں اسلوب نگارش کا رنگ روغن کہاں سے مہیا کرے گا اور چونکہ اس نے مقالے کی تکمیل کے لئے زیادہ وقت یونیورسٹی میں گزارا تھا اس لئے وہ جاپانی تہذیب وثقافت کے مناظر کہاں سے لائے گا۔مگر جب میں نے سفرنامہ پڑھنا شروع کیا تو یہ خیالات غلط ثابت ہوئے۔

سفرنامہ دھیمے دھیمے سروں میں شروع ہوتا ہے۔وہ قاری کی انگلی مضبوطی سے پکڑتا ہے اور اسے اوساکا کے تہذیبی، ثقافتی، تفریحی، تجارتی اور علمی مراکز میں لیے لیے پھرتا ہے۔وہ کبھی شن سائی باشی میں جانکلتا ہے اور کبھی نامبا میں۔نامبا سے نکلتا ہے تو بڑی بلند و بالا عمارتوں، بازاروں، ریسٹورانوں اور نہایت قیمتی سامان سے بھری دوکانوں کو غور سے دیکھتا ہوا کسی اور ہی سمت میں نکل جاتا ہے۔

ہاں ایک بات کا ذکر کرنا تو میں بھول ہی گیا ہوں کہ جب عبدالحق جاپان پہنچا تو اسے بھی وہاں کی زندگی اور آزادی دیکھ کر cultural shock کا سامنا کرنا پڑا۔ پاکستان جیسی بند، آزادیِ فکر سے محروم اور فوجی حکمرانوں کی مذہبی پالیسیوں میں جکڑے ہوئے پاکستانی جب باہر کی دنیا میں جاتے ہیں تو انہیں پے در پے ثقافتی صدمات کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ کچھ لوگ تو ثابت قدم رہتے ہیں مگر بیشتر لوگ ان صدمات کی تاب نہ لاتے ہوئے وطن واپس لوٹ جاتے ہیں۔عبدالحق

جیسا مضبوط اعصاب کا مالک ان صدمات کو سہہ گیا مگر اس کے سامنے اوسا کا یونیورسٹی کی دو تین لڑکیوں نے آٹھ منزلہ عمارت سے کود کر خودکشی کر لی تو اس کے لئے یہ ایک ناقابلِ برداشت صدمہ تھا۔ یہ اتفاق کی بات تھی کہ آغاز میں ہی اسے ان حادثات کا سامنا کرنا پڑا۔

عبدالحق پنجابی نوجوان ہوتے ہوئے گھر میں ہر روز انڈے پراٹھے کا ناشتہ کرتا تھا اور دوپہر اور رات کو دال اور آلو گوشت کھانے کا شوقین تھا۔ اوسا کا میں اسے بغیر مسالے کے کھانے اور چاول تو مل گئے مگر وہ حلال گوشت سے محروم ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے چھ مہینوں میں اس کا وزن پندرہ کلو کم ہو گیا۔ مگر اس صورتِ حال کو اس نے نہایت صبر اور شکر سے برداشت کیا۔

•••

سوموکشتی پہلوانی کے فن میں جاپان کا قومی کھیل ہے۔ پاکستانی کشتی میں پہلوان لنگوٹی باندھتا ہے جب کہ جاپان میں لنگوٹی نما لباس پہنا جاتا ہے۔ ہمارا اکھاڑا زمین پر ہوتا ہے جب کہ جاپانی اکھاڑے زمین سے کچھ اونچے ہوتے ہیں۔ جاپانی پہلوان نہایت وزنی اور دیوقامت ہوتے ہیں۔ زبردست دھکم پیل شروع ہو جاتی ہے۔ اس میں فیصلہ کُن کردار پہلوان کا وزن اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی چستی اور پھرتی کا ہوتا ہے۔۔ سوموپہلوان بہت زیادہ خوراک استعمال کرتے ہیں جو ان کے وزن کو از حد بڑھا دے جب کہ ہمارے ہاں پہلوان خوراک تو مرغن کھاتے ہیں مگر وہ بہت زیادہ ورزش بھی کرتے ہیں تا کہ ان کے بدن کسرتی ہو جائیں۔

عبدالحق نے سوموکشتی کے بارے میں بہت ہی دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کشتیوں کو گہری دلچسپی سے دیکھتے رہے ہیں۔ سوموکشتی جاپانی تہذیب کی عسکری اقدار کی امین تصور کی جاتی ہے۔ جسم کو طاقتور بنانے اور حریف کو ہر حال میں شکست دینے کا تصور جاپانی تہذیب کے عسکری عناصر کی عکاس ہے۔ جاپانی برسرِ پیکار رہنے والے لوگ ہیں۔ تجارت ہو تہذیب ہو یا صنعت و حرفت ۔۔۔ یا تعلیم و تحقیق وہ ہر سطح پر فاتح رہنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم میں انتہائی پریشان کُن شکست کے بعد جس چیز نے ان کو زندہ رکھا اور ایک نیا ملک بنانے کا پرزور عزم دیا وہ ان کی یہی صدیوں پرانی ناقابلِ شکست عسکری روح تھی۔ اس روح نے ان کو چند دہائیوں میں مغرب کے مقابل کھڑا کر دیا تھا اور جاپانی ایک عظیم قوم کی شکل میں ظاہر ہوئے تھے۔ اب میں آپ کو سوموکشتی کی مصنف کی کھینچی ہوئی تصویر دکھاتا ہوں:

'سوموکی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ پہلوان جنہیں ری کی شی (rikishi) کہا جاتا ہے، ایک گول رنگ (دوہی یو، dohiyo) میں آمنے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ گھنٹی بجتے ہی یا تو وہ مخالف کو دھکیلتے ہوئے رنگ سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں یا پاؤں کے علاوہ جسم کے کسی بھی حصے کو زمین سے لگانے کی سعی کرتے ہیں۔ جیسے ہی دونوں میں سے ایک چیز ہو جاتی ہے، مقابلہ ختم ہو جاتا ہے۔ عموماً اس مقابلے میں چند سیکنڈ ہی لگتے ہیں مگر بعض دفعہ بات کئی منٹ تک چلی جاتی ہے۔ ایسا مقابلہ بے حد سنسنی خیز ہوتا ہے۔

ہر میچ سے پہلے قدیم لباس میں ملبوس ریفری کچھ قدیم روایات کے مطابق اسے شروع کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ یہ ریفری بالکل دبلے پتلے ہوتے ہیں مگر بہت پھرتیلے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ اپنے سے چھ سات گنا وزنی پہلوانوں کے ٹکراؤ میں ملیامیٹ ہو جائیں۔

عموماً سومو پہلوان بہت موٹے ہوتے ہیں اور ان کا وزن جان بوجھ کر بڑھایا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے وزن کے زور پر مخالف کو دھکیلتے ہوئے رنگ سے باہر کر دیں۔ وہ ناشتہ نہیں کرتے مگر دوپہر کے وقت چاولوں سے بنا ایک خاص ملغوبہ کھاتے ہیں (جس میں مچھلی، گوشت اور سبزیاں ہوتی ہیں) اور بے حساب کھاتے ہیں۔ اس کے بعد کئی لٹر بیئر پی کر سو جاتے ہیں۔'

اس سفرنامے میں ہمارے سائنسدان دوست کی بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس نے ایک ان جانی دور افتادہ اور نامعلوم تہذیب میں بسنے والے انسانوں کے رویوں، ان کی تہذیبی اور پیشہ وارانہ اقدار اور ان کی ثقافتی جمالیات کو سمجھنے اور دریافت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جاپانی معاشرہ، پاکستانی معاشرہ سے بالکل مختلف ہے۔ پاکستانی معاشرہ کی اساس مذہبی ہے، مجموعی مزاج مذہبی ہے۔ مذہب زندگی کے جملہ امور پر حاوی ہے۔ سوسائٹی کسی بھی سطح پر اس سے انحراف نہیں کر سکتی ہے۔ مگر جاپانی سوسائٹی ہر طرح سے آزاد ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد مذہب وہاں سے رخصت ہو گیا ہے۔ اب وہاں مذہب تو نہیں، مذہبی اقدار کی ثقافت ضرور مل جاتی ہے۔ جاپانی اب لاشعوری طور پر ان اقدار کا منظر پیش کرتے رہتے ہیں۔

ان میں ایک بہت دلچسپ رسم 'چائے نوشی کی رسم' ہے۔ اس کا تعلق بھی بدھ مت کی ثقافتی قدروں سے ہے۔ یہ رسم جاپانی تہذیب وثقافت کی شائستگی کی علامت ہے۔ مشرقی اقوام میں ثقافت کے جو اعلیٰ ترین معیارات جاپان میں ملتے ہیں وہ کسی اور قوم میں نظر نہیں آتے ہیں۔

میں چائے نوشی کی رسم کے کچھ منظر آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔ ذرا دیکھیے کہ سائنسدان کے قلم نے کتنی چابک دستی اور فن کاری سے ان مناظر کو پیش کیا ہے۔

'ہمیں ایک ٹی ہاؤس میں لے جایا گیا۔ دو خواتین روایتی جاپانی لباس کی مونو (kimono) میں ملبوس ہمارے استقبال کے لئے دروازے پر موجود تھیں۔ یہ لباس صدیوں سے ایسا ہی ہے۔ بال بھی قدیم انداز کے جوڑے کے انداز میں گندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے سر جھکا کر ہمارا استقبال کیا اور ایک کمرے میں لے گئیں جہاں ایک تاتامی بچھی ہوئی تھی اور درمیان میں تقریباً ایک فٹ اونچی میز تھی۔

ہم میز کے اردگرد بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد ایک میزبان آئی اور ہر مہمان کے سامنے ایک پیالہ رکھ دیا گیا۔ دوسرے برتن بھی سجا دیے گئے۔ ہر برتن کو ایک خاص انداز سے صاف کیا گیا۔

ہر مہمان کے سامنے پیالہ رکھنے کا مطلب تھا کہ ہمیں اوسوچا پلائی جانی تھی۔ یعنی یہ فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ ہم کوای چا کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ وہ تین گنا زیادہ تیز ہوتی ہے۔ نشانی یہ تھی کہ کوای چا کا ایک ہی پیالہ ہوتا ہے جس سے سب ایک ایک گھونٹ لیتے ہیں۔ اوسوچا کے لئے ہر مہمان کو علیحدہ پیالہ دیا جاتا ہے۔

میزبان نے ایک برتن میں سے بانس کے بنے چمچے کے ذریعے چائے کو نکالا اور ایک بڑی چائے دانی میں ڈال دیا جس میں گرم پانی تھا۔ اس کے بعد اس نے بانس ہی سے بنے ایک tea whisk سے چائے کو پھینٹنا شروع کر دیا۔ یہ tea whisk بہت نفاست سے بنا ہوا تھا اور بانس کی بہت باریک پھچیوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ اسے ایک دو دفعہ ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ہمیں کانا پھوسی کے ذریعے بتایا گیا کہ جب میزبان چائے پیش کرے گی وہ سر کو جھکا کر اٹھائے گی۔ ہمیں بھی جواب میں ایسا ہی کرنا تھا۔'

ہم ایک طرف یہ منظر دیکھتے جاتے ہیں اور دوسری طرف ہم اس ثقافتی روح اور اقدار کو بھی محسوس کرتے جاتے ہیں جو ان مناظر کے پس منظر میں موجود ہیں۔ میں چونکہ بارہا خود بھی چائے کی رسم میں شریک ہو چکا ہوں اس لئے عبدالحق کے بتائے ہوئے ثقافتی منظر سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔

●●●

اس سفرنامے کی ایک چیز بالخصوص قابل ذکر ہے۔ اور وہ ہے جاپانی تہذیب میں پائے جانے والے توہمات۔ ان چیزوں کے بارے میں میں نے بارہا اپنے قیام کے دوران میں بہت سی باتیں سنی تھیں مگر مجھے ان باتوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ جاپان اتنی زبردست ترقی کر چکا ہے۔ یہاں پر تمام آبادی پڑھے لکھوں لوگوں کی ہے۔ مذہب کے اثرات یہاں ختم ہو چکے ہیں۔ جدید سائنسی تعلیم اور آزادی فکر کے باعث وسیع پیمانے پر سوچ بدل چکی ہے اور ایک سائنسی کلچر مکمل طور پر فروغ پا چکا ہے۔ تو ان عوامل کی روشنی میں توہمات کا جاپان میں وجود نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن جب تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ توہمات اب بھی موجود ہیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ انسان توہمات میں قدیم زمانے سے رہتا آرہا ہے اور آج بھی رہ رہا ہے۔ اور شائد یہ چیز انسانی سائیکی کا حصہ بن چکی ہے۔ میں یہاں پر اس سفرنامے میں پیش کیے گئے توہمات کا ایک حصہ آپ کو سناتا ہوں تاکہ آپ بھی میرے ساتھ ساتھ محظوظ ہو سکیں اور عبدالحق صاحب کے مشاہدات کی تحسین کر سکیں۔

'آٹھ، نو اور دس اچھے ہندسے شمار ہوتے ہیں۔ جبکہ ۴ سب سے بُرا ہندسہ سمجھا جاتا ہے۔ اسے جاپانی میں 'شی' کہتے ہیں جس کا مطلب موت بھی ہے۔ اسی لئے کئی ہوٹلوں اور ہسپتالوں میں آپ کو چوتھی منزل نہیں ملے گی۔ یعنی چوتھی منزل کو پانچویں کہا جاتا ہے۔ اس طرح پانچویں چھٹی ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ کسی کو برتنوں وغیرہ کا سیٹ تحفہ دینا ہو تو ان کی تعداد کبھی چار نہیں ہوتی۔ تین یا پانچ یا زیادہ ہوتی ہے۔

سات بھی منحوس ہندسہ ہے۔ اس لئے کہ اس کا لکھا جانا خودکشی کے لکھے جانے سے مشابہہ ہے۔ مغرب میں ۱۳ کو براشگون سمجھا جاتا ہے اور جاپانیوں نے بھی اسے برا سمجھنا شروع کر دیا ہے۔

اسی طرح ہسپتالوں کے زچہ خانوں میں ۴۳ نمبر کا بستر نہیں ہوتا وجہ یہ کہ اس کا تلفظ مردہ بچے کی پیدائش سے ملتا ہے۔ کاروں یا کسی اور گاڑی کو ۴۲ نمبر نہیں دیا جاتا۔

مردوں کے لئے ۲۵، ۴۲، اور ۶۱ سال کی عمر اور عورتوں کے لئے ۱۹، ۳۳ اور ۳۷ سال کی عمر خطرناک سمجھی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ چند دلچسپ توہمات درج ذیل ہیں:

۱۔ کسی فوتیدگی کے گھر سے آئیں تو اپنے گھر میں داخل ہونے سے پہلے پاکیزہ ہونے کے لئے

سر پر نمک چھڑک لیں۔
۲۔ کبھی بھی شمال کی طرف سر کر کے نہ سوئیں۔اس سے عمر کم ہو جاتی ہے۔
۳۔ رات کو ناخن نہ کاٹیں۔ایسا کریں گے تو والدین کے آخری وقت میں انہیں دیکھنا نصیب نہیں ہوگا۔
۴۔ کبھی بھی کسی شخص کا نام سرخ روشنائی سے نہ لکھیں۔اس لئے کہ یہ رنگ قبروں کی نشاندہی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔
۵۔ بلی اچھی قسمت کی نشانی ہے۔اس لئے کئی دوکانوں کے باہر اس کے چھوٹے چھوٹے مجسمے رکھے ملتے ہیں۔
۶۔ اگر صبح کو مکڑی نظر آ جائے تو اسے مارنا نہیں چاہیے۔مگر رات کو نظر آئے تو فوراً ماردیں۔
۷۔ اگر کسی کوّے نے آپ کی طرف دیکھ لیا تو سمجھیں کہ کچھ برا ہوگا۔
۸۔ کوئی جنازہ جارہا ہو تو اپنے انگوٹھے چھپالیں۔اگر ایسا نہ کیا تو آپ کے والدین وقت سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو سکتے ہیں۔
۹۔ رات کو سیٹی نہ بجائیں۔کوئی چور یا سانپ گھر میں داخل ہو سکتا ہے۔
۱۰۔ اگر کسی کا برا چاہتے ہیں تو مندر میں رات کے وقت ایک اور تین بجے کے درمیان جائیں۔ساتھ میں ایک گڑیا اور کچھ کیل لے جائیں۔اور مندر کے کسی درخت کے ساتھ گڑیا کو گاڑ دیں۔
۱۱۔ چٹائی کے کنارے پر پاؤں نہیں آنا چاہیے۔

اس سفرنامے کا ایک ایک صفحہ پڑھنے کے قابل ہے۔ہر صفحہ سفرنامہ نگار کے مشاہدے، تجربے اور گہری نگاہ سے سوسائٹی کو دیکھنے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔اسلوب کی شگفتگی اور خوش گوار لب ولہجہ قاری پر مسلسل اپنا گہرا اثر چھوڑتا ہے۔اس میں کوئی ایک چیز بھی دشنام طرازی کے زمرہ میں نہیں آتی۔ورنہ سفرنامہ لکھنے والے بہت کچھ اپنی طرف سے بھی شامل کر دیا کرتے ہیں۔

میں اس شاندار کام پر عبدالحق کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یہ سفرنامہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

۲۵ فروری ۲۰۱۸ عیسوی

تبسم کاشمیری

جاپان ایک تعارف

جاپان کی کہانی بڑی پرانی ہے۔

جزائر جاپان میں انسانی بود و باش کے آثار زمانہ قبل از تاریخ سے ملتے ہیں۔ مگر جاپان کے بارے میں پہلا تاریخی حوالہ پہلی صدی عیسوی کی چینی کتاب Book of Han میں دیا گیا ہے۔ جاپانی زبان میں جاپان کو نی ہون (Nihon) یا نپ پون (Nippon) کہا جاتا ہے جس کا مطلب چڑھتا سورج ہے۔

شنگھائی کی زبان میں جاپان کو زے پین (Zeppen) کہا جاتا تھا۔ مغربی تاجروں نے اسے بگاڑ کر جیاپان (Giapan) بنا دیا۔ اس لفظ کا پہلا ریکارڈ ۱۵۷۷ عیسوی میں ملتا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ لفظ جاپان میں تبدیل ہو گیا۔

یوں تو جزائر جاپان کی تعداد کافی زیادہ ہے مگر بڑے جزیرے چار ہیں جن میں ہونشو (Honshu) سب سے بڑا اور اہم ہے۔ اس کے شمال میں ہوکائیڈو (Hokkaido) اور مغرب میں شی کوکو (Shikoku) اور کیوشو (Kyushu) کے جزائر ہیں۔

ہونشو کی آبادی دس کروڑ سے زیادہ ہے جو زیادہ تر ساحلی علاقوں میں آباد ہے۔ یہ جزیرہ ہمیشہ جاپان کا سیاسی اور تمدنی مرکز رہا ہے۔ اس لئے تمام بڑے شہر اور تاریخی اہمیت کے مقامات ہونشو پر ہی واقع ہیں۔ ان میں ٹوکیو، اوساکا، نارا، کیوٹو، کوبے، ناگویا اور ہیروشیما قابل ذکر ہیں۔

ہوکائیڈو جاپان کا دوسرا بڑا جزیرہ ہے۔ ہوکائیڈو اور ہونشو کے درمیان میں سمندر ہے۔ دونوں جزیروں کو ایک زیرِ سمندر سرنگ ملاتی ہے جسے سیکن (Seikan) کہتے ہیں۔ سب سے بڑا شہر سوپورو (Sopporo) ہے جس کی آبادی بیس لاکھ کے قریب ہے۔ ہر سال یہاں Sopporo snow festival ہوتا ہے جسے بیس لاکھ سے زیادہ سیاح دیکھنے آتے ہیں۔

کیوشو تیسرا بڑا جزیرہ ہے جس کی آبادی سوا کروڑ کے قریب ہے۔ یہ پہاڑی علاقہ ہے اور جاپان کا سب سے مشہور آتش فشاں ماؤنٹ ایسو (Mt. Aso) اسی جزیرے پر ہے۔ سب سے بڑا شہر فکوکا (Fukuoka) ہے جس کی آبادی پندرہ لاکھ ہے۔ ناگاساکی بھی کیوشو کا شہر ہے۔

بڑے چار جزیروں میں سب سے چھوٹا شکوکو ہے جس کی آبادی صرف چالیس لاکھ ہے۔ ماتسویاما اور تاکاماتسو قابلِ ذکر شہر ہیں۔

اس کے علاوہ کئی چھوٹے جزیرے ہیں جن میں اوکی ناوا (Okinawa) سب سے مشہور ہے۔

●●●

جاپان کا قدیم مذہب شن تو (Shinto) ہندومت سے کافی متاثر ہے۔ اسی وجہ سے جاپانی اور ہندو دیومالاؤں میں بھی مماثلت پائی جاتی ہے۔ آج بھی ۸۰ فیصد جاپانیوں کا مذہب شن تو ہی ہے۔

جاپانی دیومالا کے مطابق جزائر جاپان کی تخلیق مرد دیوتا ایزاناگی (Izanagi) اور عورت دیوتا ایزانامی (Izanami) کے ملاپ سے ہوئی۔

کہا جاتا ہے کہ بہت سے دیوتاؤں نے ان دونوں کو بلایا اور درخواست کی کہ ایک نئی زمین تخلیق دیں (یعنی جاپان)۔ انہیں ایک نیزہ دیا گیا کہ پانی کو ہلائیں۔ جب انہوں نے ایسا کرنے کے بعد نیزہ اٹھایا تو اس سے قطرے ٹپکنے لگے۔ ان ٹپکتے قطروں سے ایک جزیرہ وجود میں آیا۔ دونوں دیوتاؤں نے وہاں رہنا شروع کر دیا اور ایک محل بنایا۔ اس محل میں ایک بڑا ستون تھا۔ جب انہیں بچے کی خواہش ہوتی تو مرد دیوتا بائیں طرف سے ستون کے گرد چکر لگاتا اور عورت دیوتا دائیں طرف سے مرد دیوتا کا استقبال کرتی۔ اس طرح دو بچے (جزائر) پیدا ہوئے جو بری خصلت کے تھے۔ اس وجہ سے انہیں محل سے نکال دیا گیا۔

دیوتاؤں نے اپنا طریقہ بدلا اور قدرت کے اصول کے مطابق عورت دیوتا کی بجائے مرد دیوتا نے پکار کر اپنے ساتھی کا استقبال کیا۔ اس طریقہ سے آٹھ بہترین جاپانی جزائر وجود میں آئے۔ اس کے بعد اور چھوٹے چھوٹے جزائر کا جنم ہوا۔

ایک زچگی کے دوران عورت دیوتا کا انتقال ہوگیا اور مرد دیوتا اسے دوبارہ زندگی دینے کی کوشش میں موت کی وادی میں چلا گیا مگر گھبرا کر بھاگا اور دوبارہ زندوں کی دنیا میں آ گیا۔ اس کی بائیں آنکھ سے سورج دیوتا، دائیں آنکھ سے چاند دیوتا اور ناک سے طوفان دیوتا کی پیدائش ہوئی۔

●●●

چیزوں کو پاک کرنے کی رسومات شن تو مذہب کا بنیادی حصہ ہیں۔ انہیں روزانہ، ہفتہ وار، موسم کے اعتبار سے، چاند تاریخ کے مطابق اور سالانہ بنیادوں پر انجام دیا جاتا ہے۔ اس جدید دور میں بھی ان رسومات کا پابندی سے اہتمام ہوتا ہے۔ نئی عمارات کا افتتاح ایک شن تو راہب انہیں رسومات سے کرتا ہے۔ اسی طرح ہر نئی چیز مثلاً نئی کار کو استعمال سے پہلے پاک کیا جاتا ہے۔

جاپان کا دوسرا بڑا مذہب زین (Zen) ہے جو بدھ مت کی ایک قسم ہے۔ اس کا آغاز چین سے ہوا۔ اس کے بنیادی نکات اپنی ذات پر قابو رکھنا اور روشنی حاصل کرنے کے لئے عبادات کرنا ہے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے دماغ کا تعلق سانس سے جوڑا جاتا ہے۔

یہ سب چیزیں اپنی جگہ اور یہ بھی صحیح کہ جاپانی یہ رسومات بہت دھوم دھام سے ادا کرتے ہیں مگر درحقیقت ان کی عملی زندگی میں کسی مذہب کا کوئی دخل نہیں۔ وہ کھلم کھلا خدا سے انکاری ہیں۔ مگر مصیبت کے وقت خدا ضرور یاد آ جاتا ہے۔ اس کا ثبوت ہر وقت بھرے ہوئے مندر ہیں۔

●●●

زمانہ قدیم میں جاپان کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور قبائل میں بٹا ہوا تھا۔ چوتھی صدی عیسوی میں ایک مرکزی حکومت قائم ہوئی جس کا سرپرست ایک شہنشاہ تھا۔ وہی شاہی خاندان اب تک حکمرانی کرتا چلا آ رہا ہے جو زیادہ تر برائے نام ہی ہے۔

۷۹۴ عیسوی میں کیوٹو (Kyoto) کو دارالخلافہ بنایا گیا۔ اس وقت اس کا نام ہیان کیو (Heian-kyo) تھا۔ یہ دور جسے ہیان دور بھی کہا جاتا ہے ۱۱۸۵ عیسوی تک رہا۔ اس کے بعد شہنشاہ

کی طاقت آہستہ آہستہ کم ہوتی چلی گئی اور اصل حکومت فوجی جنگجوؤں کے ہاتھ میں چلی گئی جن کے سربراہ کوشوگن (shogun) اور سپاہیوں کو ساموراِئی (samurai) کہا جاتا ہے۔

پرتگالی تاجر ۱۵۴۳ عیسوی میں جاپان آئے اور ناگاسا کی بندرگاہ کی بنیاد رکھی۔ان کے استعمال میں بندوقیں اور بارود جاپانیوں کے لئے عجوبہ تھیں۔ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے یہ دوستی قبول کی۔ورنہ تمدنی لحاظ سے وہ پرتگالیوں کو بہت کم تر سمجھتے تھے۔

سولہویں صدی عیسوی کے آخری حصہ میں شوگن اودا نابوناگا (Oda Nabunaga) نے جاپان کو متحد کیا مگر اس کے جانشین شوگن تویوتومی ہیدے یوشی (Toyotomi Hideyoshi) کا نام جاپانی تاریخ میں زیادہ نمایاں ہے۔۱۵۹۸ عیسوی میں ہیدے یوشی کی وفات کے بعد شہنشاہ نے توکوگاوا اِی اے یاسو (Tokugawa Ieyasu) کو شوگن مقرر کیا جس نے ایڈو (Edo) یعنی موجودہ ٹوکیو (Tokyo) کی بنیاد رکھی۔۱۶۰۰ عیسوی سے ۱۸۶۸ عیسوی کے دور کو Edo period کہا جاتا ہے۔یہ پرامن دور تھا اور جاپان نے بہت ترقی کی۔مگر اس دور میں ذات پات کے نظام کو سختی سے نافذ کیا گیا اور باہر کی دنیا سے تمام تعلقات منقطع کر لئے گئے۔

فوجی حکمرانوں (شوگن) کے دور میں ایک بہت سخت اور پابندیوں میں جکڑا ہوا طرزِ زندگی پروان چڑھا جس پر قومی تفاخر اور انفرادی غیرت کی نمایاں چھاپ تھی۔

اسی دور میں سیپوکو (seppuku) جسے عام طور پر ہرا کی ری (harakiri) بھی کہا جاتا ہے، کو رواج دیا گیا۔اس کا مطلب ہے پیٹ کاٹ کر خودکشی کرنا۔ابتدا میں یہ صرف سپاہیوں کے لئے مختص تھی۔اگر وہ دشمنوں میں گھر جاتے تو بجائے ذلت سے مرنے کے یہ طریقہ اختیار کرتے۔ اسی لئے سپاہیوں کی کمر کے ساتھ ایک تلوار آویزاں ہوتی اور ایک خنجر بھی لازمی ہوتا تا کہ بوقت ضرورت خودکشی کی جا سکے۔بعض دفعہ کسی سنگین جرم کے نتیجے میں انہیں اس طرح خودکشی کرنے کا حکم دیا جاتا۔اس طرز خودکشی کی سب سے پہلی مثال بارہویں صدی عیسوی میں ملتی ہے۔

آہستہ آہستہ یہ طریقہ عام لوگوں میں بھی پھیل گیا۔آج بھی جاپان میں خودکشی عام ہے اور اسے باعث عزت سمجھا جاتا ہے۔

نظم وضبط کی تربیت کے ساتھ ساتھ تعلیم کو بھی فروغ دیا گیا اور صاف ستھرا طرز زندگی پروان چڑھا۔

جب پرتگالیوں نے سرزمین جاپان پر قدم رکھا تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کا سامنا نسبتاً کہیں زیادہ متمدن قوم سے تھا۔ مثلاً وہ مہینے میں ایک دفعہ نہاتے تھے، جاپانی روز نہاتے تھے۔ ہر میدان میں انہوں نے جاپانیوں کو اپنے سے بہتر پایا۔

دوسری طرف جاپانی انہیں جنگلی کہہ کر پکارتے تھے۔

فوجی حکمرانوں کے نزدیک یہ فرق اتنا نمایاں تھا کہ انہوں نے تجارتی مفادات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے غیر ملکیوں کی آمد پر پابندی لگادی اور بیرونی دنیا سے ناطہ توڑ لیا۔

اس منظم طرز زندگی کو برقرار رکھا گیا اور یہ نسل در نسل منتقل ہوتا گیا۔ اسی وجہ سے آج کی جدید دنیا میں بھی جاپانیوں سے زیادہ منظم کوئی قوم نہیں۔

خود کو دنیا سے علیحدہ کرنے کے فیصلے کے پیچھے ایک اور عنصر بھی تھا۔ جاپانیوں کو ڈر تھا کہ ان کی نسل میں ملاوٹ نہ ہو جائے۔ یہ سوچ آج بھی کارفرما ہے۔ جاپانی اپنی نسل کو چینی اور کورین نسلوں سے برتر سمجھتے ہیں اور متمول گھرانے شجرہ نسب نکال کر اطمینان کر لیتے ہیں کہ جس گھر میں شادی ہو رہی ہے اس خون میں کورین یا چینی خون کی ملاوٹ تو نہیں۔

•••

۱۸۵۳عیسوی میں میتھیو پیری (Methew Perry) کی آمد نے جاپانی تنہائی کو زبردستی ختم کر دیا۔ پیری امریکی امیر البحر تھا۔ اس زمانے میں امریکہ مشرق میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہا تھا اور اس کے قدم چین تک پہنچ گئے تھے۔

امریکہ کے لئے جاپان کی تنہا پسندی ناقابلِ قبول تھی۔ اس لئے پیری کو یہ مشن دیا گیا کہ چاہے طاقت ہی استعمال کرنی پڑے، جاپان میں مداخلت کرے۔ جاپانی اپنی ۲۲۰ سالہ تنہائی ختم کرنے کو تیار نہیں تھے مگر پیری کے بحری بیڑے کی توپوں نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ اپنے خول سے باہر نکلیں۔ اس کی ایک وجہ جاپانی فوجی سربراہ کی بیماری بھی تھی جس کی وجہ سے کوئی واضح فیصلہ نہ ہو سکا کہ دشمن کا مقابلہ کیسے کیا جائے۔

جاپانیوں کو لین دین بھی کرنا پڑا اور اس طرح مغربی اثر و رسوخ کی راہ کھل گئی۔

پیری کی آمد کی وجہ سے فوجی حکمرانی کا دور بھی ختم ہوا اور ۱۸۶۸عیسوی میں شہنشاہ کو کلی طور پر بااختیار بنا دیا گیا۔ یہاں سے مے جی (Meiji) دور کا آغاز ہوا۔ بیرونی دنیا سے روابط استوار

کئے گئے، جدید علوم کو اپنایا گیا اور کچھ ہی عرصہ میں جاپان ایک عالمی طاقت بن گیا۔

انیسویں صدی عیسوی کے اختتام کے وقت جاپان میں شرح خواندگی نوے فیصد سے بھی زیادہ تھی۔

۱۹۱۲ سے ۱۹۲۶ عیسوی کو تائشو (Taisho) شہنشاہ کی نسبت سے تائشو دور کہا جاتا ہے۔ اس دوران فوج نے پھر غلبہ حاصل کر لیا اور بادشاہت اور عوامی طاقت برائے نام رہ گئی۔ ۱۹۳۱ عیسوی میں منچوریا پر حملہ ہوا اور ۱۹۳۷ عیسوی میں چین سے ایک طویل جنگ چھیڑ دی گئی۔

دسمبر ۱۹۴۲ عیسوی میں پرل ہاربر پر حملے نے جاپان کو امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے مخالف دوسری جنگ عظیم میں دھکیل دیا۔ جاپانی فوج بہت سخت جان ثابت ہوئی اور اپنی قوت سے بڑھ کر فتوحات حاصل کرتی چلی گئی۔ یہ سلسلہ شاید جاری رہتا مگر ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹمی حملوں نے شہنشاہ ہیروہیتو (Hirohito) کو ۱۴ / اگست ۱۹۴۵ عیسوی کو ریڈیو پر شکست تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔

عام جاپانیوں کے لئے یہ اعلان ناقابلِ یقین تھا۔ ان کی نفسیات میں یہ بات ڈال دی گئی تھی کہ شہنشاہ نعوذ باللہ خدا تھا اور فوج ناقابلِ شکست تھی۔ یہ اعلان سنتے ہی کئی جاپانیوں نے خودکشی کر لی۔

•••

اس شکست کے نتیجے میں جاپان ۱۹۴۵ سے ۱۹۵۲ عیسوی تک اتحادیوں کے کنٹرول میں رہا۔ اس دوران امریکی جنرل میک آرتھر (Mac Arthur) سیاہ وسفید کا مالک تھا۔ اس نے بہت سی انقلابی تبدیلیاں کیں۔ زمینداروں سے زمین لے کر کسانوں میں تقسیم کر دی گئی اور لیبر یونین کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس کے علاوہ فوج کا اثر ورسوخ ختم کر دیا گیا اور جمہوریت کو پروان چڑھایا گیا۔ اب کابینہ شہنشاہ کو نہیں، قومی اسمبلی (جسے Diet کہتے ہیں) کو جوابدہ تھی۔ شہنشاہیت برقرار رکھی گئی مگر شہنشاہ کو اعلان کرنا پڑا کہ وہ غیر مرئی نہیں بلکہ عام انسان ہے۔

جاپان کا نیا آئین ۱۹۴۷ عیسوی میں نافذ ہوا اور اس کی شق ۹ کے تحت جاپان نے اعلان کر دیا کہ کسی دوسرے ملک سے جنگ نہیں کرے گا۔

۱۹۵۱ عیسوی میں سان فرانسسکو معاہدہ ہوا جس سے سرکاری طور پر امریکہ اور جاپان

کے تعلقات معمول پر آ گئے۔ ۱۹۵۲ عیسوی میں اتحادیوں نے جاپان کا قبضہ چھوڑ دیا مگر کئی چھوٹے جزیرے امریکہ کے کنٹرول میں رہے۔ آہستہ آہستہ یہ بھی واپس کر دیے گئے۔ ان میں آخری اوکی ناوا (Okinawa) تھا جو ۱۹۷۲ عیسوی میں واپس ہوا۔ اس کے باوجود امریکہ نے ان جزیروں پر اپنے فوجی اڈے قائم رکھے جواب بھی ہیں۔

اس پانچ سالہ اتحادی قبضے کے جاپانی نفسیات پر اثرات بہت متنوع تھے۔ جاپانیوں کی ایک بڑی تعداد نے امریکہ کو ایک ماورائی طاقت سمجھ لیا جس نے ان کے خدا یعنی شہنشاہ کو شکست دی تھی۔ اس کے نتیجے میں انہوں نے ہر امریکی چیز کو برتر مان لیا۔ وقت کے ساتھ یہ رجحان تبدیل ہو رہا ہے اور بہت سے جاپانی امریکہ سے نفرت کرتے ہیں۔ مگر بحیثیت مجموعی جس طرح جاپانیوں نے مغربی تہذیب وتمدن کو گلے لگایا ہے اس کی ترقی یافتہ دنیا میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

اس نفسیاتی یلغار کی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جاپانیوں کے پاس کوئی قابلِ عمل مذہب نہیں تھا جو اس ثقافتی ریلے کے سامنے بند باندھتا۔ سماجی ڈھانچہ تو بہت مضبوط تھا مگر وہ بیرونی اثرات کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھا۔

●●●

شی گیرو یوشیدا (Shigeru Yoshida) ۱۹۴۱ سے ۱۹۴۶ عیسوی اور ۱۹۴۸ سے ۱۹۵۴ عیسوی کے دوران وزیراعظم رہے اور ان کی پالیسیوں نے جدید جاپان کی بنیاد رکھی۔ ان پالیسیوں کے بنیادی نکات امریکہ سے گہرے تعلقات اور معیشت پر توجہ تھے۔ خارجہ پالیسی برائے نام رہ گئی۔ جو امریکہ کی پالیسی وہی جاپان کی۔ یہ صورت حال کسی حد تک اب بھی برقرار ہے۔

وزیراعظم یوشیدا کی لبرل پارٹی ۱۹۵۵ عیسوی میں ایک نئی پارٹی لبرل ڈیموکریٹک پارٹی میں ضم ہوگئی۔ یہ پارٹی اب تک جاپانی سیاست پر چھائی ہوئی ہے۔

یوشیدا کی حکومت کے ابتدائی دور میں بے شمار جاپانیوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ بھیجا گیا مگر جاپانی قومیت کے جذبے کے تحت ۹۹ فیصد لوگ واپس آ گئے اور ملک کی تعمیرِ نو میں جت گئے۔ امریکہ میں انہیں شاندار زندگی کے مواقع میسر تھے اور جاپان میں شدید غربت اور بے روزگاری کا سامنا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں جاپانی گھاس کھانے پر مجبور تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے ملک کو ترجیح دی۔

اس جذبے کا مقابلہ اپنے ملک سے کریں۔ ہم لوگ گفتار کے غازی تو ہیں مگر ملک کی خاطر قربانی دینے کے لئے شاید بہت کم لوگ تیار ہیں۔ اگر جاپانیوں کی طرح ہمارے پڑھے لکھے لوگ بھی واپس آتے تو ایک ایسی قوت پیدا ہوسکتی تھی جو موجودہ فرسودہ نظام کا تختہ الٹ دیتی۔

۱۹۶۸ عیسوی میں جاپان دنیا کی دوسری بڑی اقتصادی قوت بن گیا اور اتنی خوش حالی آئی کہ غربت کا نام ونشان مٹ گیا۔ اگرچہ آنے والے دنوں میں جاپانی معیشت مختلف مواقع پر اُتار چڑھاؤ کا شکار ہوئی مگر بنیاد اتنی مضبوط تھی کہ ان بحرانوں سے عام آدمی کو متاثر کئے بغیر نکل گئی۔

●●●

حصہ اوّل

باب اوّل

(اپریل ۱۹۸۸ تا ستمبر ۱۹۸۸ عیسوی)

۱

میں ۱۹۷۵ عیسوی میں ایم ایس سی مائکروبیالوجی کرنے کے بعد پنجاب میڈیکل کالج میں کنٹریکٹ پر ڈیمانسٹریٹر (لیکچرر) کی ملازمت حاصل کر چکا تھا۔ ہر امتحان میں فرسٹ ڈویژن اور دو یونیورسٹی پوزیشنز کی وجہ سے خود اعتمادی تھی اور میں مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔

یہ ۱۹۸۰ عیسوی کی دہائی کے ابتدائی سالوں کی بات ہے۔ اس زمانے میں موجودہ دور کی سہولتیں نہیں تھیں۔ خط و کتابت پر ہی انحصار کرنا پڑتا تھا۔ جواب آنے میں کئی کئی مہینے لگ جاتے تھے۔ یوں سمجھیے کہ عادت سی بن گئی تھی کہ جہاں دیکھا درخواست بھیج دی۔ بیرونِ ملک ہو یا اندرونِ ملک۔

کوشش پی ایچ ڈی میں داخلے کی تھی۔ ۱۹۸۳ عیسوی میں کامیابی ہوئی اور امریکہ کی الی نائے (Illinois) یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مارچ ۱۸۹۴ عیسوی میں والد صاحب کا انتقال ہو گیا اور یہ معاملہ ختم ہو گیا۔ اس جاں گسل صدمے سے ذہنی اور معاشی طور پر سنبھلنے میں وقت لگا۔

اس دوران پبلک سروس کمیشن سے کامیابی کے بعد میری نوکری پکی ہو چکی تھی مگر دل میں پی ایچ ڈی کی آرزو مچل رہی تھی۔ چنانچہ درخواستیں بھیجنے کا سلسلہ جاری تھا۔ درخواست بھیجتا تھا اور بھول جاتا تھا۔ یعنی یہ ایک معمول کا عمل بن گیا تھا۔

مارچ ۱۹۸۷ عیسوی میں اخباروں میں وزارت تعلیم کی طرف سے اشتہار آیا۔ فہرست

میں کوئی مغربی ملک شامل نہیں تھا۔ جن ملکوں کا ذکر تھا ان میں جاپان ہی بہتر لگا۔ اس کا پہلے نمبر پر انتخاب کیا اور درخواست بھجوا دی۔

کئی مہینے گزر گئے مگر کوئی اطلاع نہ آئی۔ گزشتہ تجربات کی روشنی میں میں نے معاملہ ختم ہی سمجھا۔ انہی دنوں میں پنجاب گورنمنٹ نے آسٹریا میں دو سال کے مالیکیولر بیالوجی کے کورس کے لیے میرا انتخاب کر لیا اور میں اس کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

جنوری ۱۹۸۸ عیسوی کے اوائل میں اچانک ایک شام میرے سسر کا اسلام آباد سے فون آیا کہ راتوں رات سفر کرو اور اسلام آباد پہنچو۔ تفصیل کوئی نہیں بتائی۔

میرے سسر ریٹائرڈ میجر غلام محی الدین کی عمر اس وقت ۹۷ سال ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ ہمارے سر پر تا دیر قائم رکھے۔ آمین۔ وہ جماعت اسلامی سے منسلک ہیں اور ۱۹۷۲ عیسوی میں فیصل آباد کی قومی اسمبلی کی ایک نشست سے انتخاب لڑ چکے ہیں۔ ان کی ہاکی کے مشہور کھلاڑی اور منتظم کرنل عاطف سے گہری دوستی تھی۔ کرنل عاطف نے انہیں اسلام آباد بلا لیا تھا اور سپورٹس کمپلیکس میرے سسر کی زیر نگرانی تعمیر ہوا تھا۔

●●●

میں صبح بذریعہ بس اسلام آباد پہنچا تو طوفانی بارش ہو رہی تھی مگر میرے سسر ایک فوجی جیپ لئے میرے منتظر تھے۔ جیپ نے سیدھا وزارت سائنس اور ٹیکنالوجی کا رخ کیا۔

راستے میں انہوں نے تفصیلات بتائیں۔ جس سیکشن میں اس سکولرشپ کے بارے میں کام ہو رہا تھا اس کے انچارج میرے سسر سے قرآن شریف پڑھتے رہے تھے اور ان کے بہت معتقد تھے۔ انہیں میری عرضی کے بارے میں بتا دیا گیا تھا کہ دھیان رکھیں۔

ایک دن کاغذات کی پڑتال کرتے ہوئے ان پر عجب انکشاف ہوا۔ میرٹ لسٹ میں میرا نام پورے پاکستان میں پہلے نمبر پر تھا اور اس وجہ سے مجھے آفر لیٹر بھجوا دیا گیا تھا۔ مگر وہ خط گھومتا گھماتا واپس آ گیا تھا اور جس دن میں وہاں پہنچا وہ consent دینے یعنی حامی بھرنے کی آخری تاریخ تھی۔

آخر خط مجھ تک کیوں نہیں پہنچا؟

وجہ یہ تھی کہ متعلقہ کلرک نے کسی سے معاملہ کر لیا تھا۔ اس نے خط پر پتہ تو سارا صحیح لکھا

مگر شہر فیصل آباد کی بجائے اسلام آباد لکھ دیا۔ ظاہر ہے کہ خط نے سیر کر کے واپس ہی آنا تھا۔
ان کلرک صاحب کی مجھ سے پچھلے نمبر والوں سے ملی بھگت تھی۔ اگر میں اس آخری دن تک جواب نہ دیتا تو ظاہر کر دیا جانا تھا کہ میری اس سکولر شپ میں دلچسپی نہیں۔ اس لئے اگلے شخص کو موقع دیا جائے۔

یہ سارا معاملہ انچارج صاحب کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ اس لئے انہوں نے مجھے راتوں رات اسلام آباد پہنچنے کا حکم دیا تھا۔ میں نے رسمی کارروائیاں کیں۔ کچھ فارم بھرے اور دستخط کئے اور اس طرح جاپان جانا میرا مقدر بنا۔ اگر چہ میرے سسر اور ان کے شاگرد اس معاملہ میں وسیلہ بنے مگر در حقیقت یہ اللہ تعالیٰ کا انعام تھا۔

اگر میری عمر یکم اپریل ۱۹۸۸ عیسوی کو ۳۵ سال سے زائد ہوتی تو میں اس سکولر شپ کا حقدار نہ ہوتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ہی انتظام تھا کہ میری عمر صرف ۲۵ دن کم تھی۔

اس طرح میں پاکستان میں جاپانی حکومت کے مون بوشو (Monbusho) سکولر شپ کو حاصل کرنے والا پہلا شخص بنا۔ آنے والے وقت نے یہ ثابت کیا کہ یہ دنیا کا بہترین سکولر شپ تھا۔ یہ ماہانہ وظیفہ میری تنخواہ سے چھ سات گنا زیادہ تھا۔ اللہ کے اس احسان کی وجہ سے نہ صرف میں نے تعلیمی میدان میں ترقی کی بلکہ مجھے مالی استحکام بھی ملا۔

ابھی ایک مرحلہ باقی تھا۔ میں نے اپنی دلچسپی کے موضوعات کی نشاندہی کر دی تھی۔ اس کے مطابق جاپانی وزارتِ تعلیم نے میرے لئے موزوں لیبارٹری کا انتخاب کرنا تھا۔ اس میں کوئی مشکل یوں نہیں تھی کہ جاپانی حکومت نے اس لیبارٹری کو بھی ایک خطیر رقم دینی تھی۔

اب دعا یہی تھی کہ کسی بڑی یونیورسٹی اور بڑے شہر میں جگہ ملے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے میں بھی اپنی خاص عنایت کی۔ مجھے اوساکا شہر کی اوساکا نیشنل یونیورسٹی کے ادارے بی کین (Biken) سے بلاوا آیا۔ اوساکا جاپان کا دوسرا بڑا شہر ہے اور یہ یونیورسٹی تیسری بڑی یونیورسٹی ہے۔ اور بی کین دنیا میں میڈیکل مائکروبیالوجی کا تیسرا بڑا مرکز ہے۔

●●●

میرے والد صاحب ڈاکٹر عبدالحمید صاحب کے انتقال کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور میری والدہ کی طبیعت بہت حساس ہو گئی تھی۔ وہ میری تیاریوں کو دیکھتی تھیں اور عجب شش و پنج

میں تھیں۔ وہ میری جدائی بھی برداشت نہیں کرسکتی تھیں اور میری ترقی کی راہ میں حائل بھی نہیں ہونا چاہتی تھیں۔

ایک دن ان کی ممتا غالب آ گئی اور میرے کمرے میں آ کر کہنے لگیں:

'بو نہ جا'۔

میں نے انہیں حوصلہ دیا۔ اس کے بعد ان کا صبر ہمیشہ غالب رہا اور انہوں نے اپنی کشمکش کو کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔

میری اہلیہ ڈاکٹر صالحہ اور دونوں بیٹیاں اسما اور حنا بھی رنجیدہ تھیں مگر ان کے پیش نظر ایک بہتر مستقبل کی نوید بھی تھی۔

اپنے بھائی ڈاکٹر طارق حمید کے بغیر میرا جاپان جانا ممکن نہ تھا۔ ہم اپنے آبائی گھر میں اکٹھے رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اپنی فیملی کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔

اس کے علاوہ ایک اور فرد تھا جس کے لئے میرا جانا ایک بہت مشکل مرحلہ تھا۔ میری دادی جان کی عمر ۹۰ سال سے تجاوز کر چکی تھی اور ان کی صحت اچھی نہیں تھی۔ انہیں شروع ہی سے میرے ساتھ بہت لگاؤ تھا۔ ان کے شوہر اور چھ بیٹے فوت ہو چکے تھے اور اب میری ذات ان کے لئے مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔

یہاں اگر دو عظیم ہستیوں کا ذکر نہ ہو تو کوتاہی ہوگی۔ یہ ہستیاں میرے ماموں حاجی عبدالعزیز اور حاجی عبدالرشید ہیں۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ اپنے سماجی مرتبے اور اثر ورسوخ کی وجہ سے ویسے ہی ان کی حیثیت خاندانوں کے سرپرست کی تھی مگر والد صاحب کے انتقال کے بعد ہم لوگ براہ راست ان کی زیر شفقت تھے اور ہر معاملہ میں وہ ہمارے رہنما تھے۔ اس موقعہ پر بھی ان کا کردار بہت اہم تھا۔ خاص طور پر والدہ کو حوصلہ دینے میں۔ اس کے بعد بھی جاپان سے میری آمد اور روانگی کے وقت وہ اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود ہمیشہ ائرپورٹ پر موجود ہوتے۔

●●●

۲

مارچ کے اوائل میں میرا ٹکٹ آ گیا۔ ۶ / اپریل ۱۹۸۸ عیسوی کو میری روانگی تھی۔ شام کے وقت میں فیصل آباد سے پی آئی اے کے جہاز میں سوار ہوا۔ یہ میرا ہوائی سفر کا پہلا تجربہ تھا۔ مگر جہاز کے ہوا میں بلند ہوتے وقت کان کے پردے پر دباؤ کے سوا کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھی۔

کراچی ائرپورٹ پر دو تین گھنٹے قیام کے بعد ہمیں جہاز کی طرف جانے کو کہا گیا۔ JAL (جاپان ائرلائن) کا ایک دیوقامت جہاز ہمارا منتظر تھا۔ مجھے بزنس کلاس کا ٹکٹ دیا گیا تھا۔ جہاز پر محنت کش طبقے کے کئی لوگ بھی سوار تھے۔ آج کل شاید یہ بات ناقابلِ یقین ہو مگر حقیقت ہے کہ اس زمانے میں جاپان جانے کے لئے ویزے کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر یہ صورتِ حال زیادہ دیر برقرار نہیں رہی۔ غالباً ۱۹۸۹ عیسوی کے شروع میں ویزہ کی پابندی لگ گئی۔

۱۹۶۰ عیسوی کی دہائی میں پاسپورٹ کا حصول مشکل تھا مگر سوائے چند ملکوں کے ویزے کی ضرورت نہیں تھی۔ پاکستان کی اتنی عزت تھی۔ مگر ہمارے ہاں کوئی چیک اینڈ بیلنس نہیں تھا۔ ہر قماش کے لوگ غیر ممالک میں گئے۔ غیر قانونی حرکتیں کیں، جرائم میں ملوث ہوئے اور آہستہ آہستہ ایک کے بعد دوسرے ملک نے ویزہ کی پابندی لگانا شروع کر دی۔ جاپان کا راستہ ۱۹۸۰ عیسوی کی دہائی کے شروع میں نظر آیا تھا اور اسے بند ہونے میں دس سال بھی نہیں لگے۔ اب عام آدمی کے لئے جاپان کا ویزہ لینا امریکہ، برطانیہ کے ویزے سے بھی مشکل ہے۔

●●●

ناتجربہ کاری کی وجہ سے مجھ سے ایک غلطی ہوگئی۔ میں نے سامان ٹوکیو کے لئے بک کرا دیا جب کہ میرا ٹکٹ اوساکا تک کا تھا۔ شاید میرے ذہن میں تھا کہ سامان خود ہی اوساکا کے جہاز میں منتقل ہو جائے گا۔

فیصل آباد اور کراچی میں موسم گرم تھا اور میں نے اسی حساب سے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ جب ہم اوساکا پہنچے تو شدید سردی تھی اور ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ سوچا کہ سامان ملتا ہے تو سویٹر نکال کر پہن لوں گا۔ مگر جلد ہی پتہ چل گیا کہ میں تو اوساکا پہنچ گیا ہوں مگر میرا سامان نہیں۔ وہ ٹوکیو میں رہ گیا تھا۔ ائرلائن والوں نے تسلی دی کہ اگلے دن سامان مل جائے گا۔ مجھے یہ فکر تھی کہ اٹیچی کیس کے باہر تو کوئی نشانی نہیں البتہ اس کے اندر میرا نام اور پتہ موجود تھا۔ میں نے یہ اطلاع متعلقہ عملے کو دے دی۔

ائرپورٹ کے باہر کچھ اہل کار میرے نام کا پلے کارڈ لے کر کھڑے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹہ کے سفر کے بعد ہم ہوسٹل پہنچ گئے۔

یہ بہت بڑا ہوسٹل تھا جس کے دو حصے تھے۔ ایک مردوں کے لئے اور دوسرا عورتوں کے لیے۔ بہت خوب صورت علاقہ تھا۔ قریب ہی دو پارک تھے۔ کھلی سڑکیں تھیں اور مارکیٹ بھی قریب ہی تھی۔

میرا کمرہ چوتھی منزل پر تھا۔ لفٹ نہیں تھی۔ کچھ عرصہ بعد یہ صورت حال بدل گئی اور مجھے دوسری منزل پر سیڑھیوں کے عین سامنے ۲۱۵ نمبر کمرہ مل گیا۔

کمرے میں کمبل بھی تھا اور ہیٹر کا انتظام بھی۔ رات آرام سے کٹ گئی۔ اگلے دن میرا سامان بھی آ گیا۔

●●●

صبح کینٹین میں ناشتہ کے بعد مجھے ایک ہدایت نامہ پکڑا دیا گیا۔ ہوسکتا ہے بعد کے دنوں میں طالبان نے اس سے استفادہ کیا ہو۔ مرد عورتوں کے حصے میں نہیں جاسکتے تھے اور عورتیں مردوں کے حصے میں نہیں آسکتی تھیں۔ اگر جانا ناگزیر ہو تو وجہ بتا کر تحریری اجازت کی ضرورت تھی۔

مجھے حیرت تو ہوئی کہ جاپان کا جو تعارف تھا یہ تحریر اس کے مطابق نہیں تھی۔ مگر میرے لئے اس میں تشویش کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ میں کمرے میں آیا اور سو گیا۔ ابھی سفر کی تھکان باقی تھی۔

شام کو کمرے سے باہر نکلا تو منظر ہی کچھ اور تھا۔ برآمدے میں کئی لڑکیاں بے تکلف گھوم رہی تھیں۔ ابھی اس صورت حال کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ کئی بند دروازوں کے باہر do not disturb یعنی 'تخلیہ میں مخل نہ ہوں' کے کارڈ لٹکتے نظر آئے۔

ہدایت نامہ دینا ہوسٹل انتظامیہ کا فرض تھا جو اس نے ادا کر دیا۔ کوئی اجازت مانگتا تو ہاں یا نہ ہوتی۔ یہاں تو کوئی اجازت ہی نہیں مانگتا تھا۔ انتظامیہ کیا کرتی۔ بے بس تھی۔

●●●

جس جگہ یہ ہوسٹل ہے اس کا نام تسوگومودائی (Tsugomodai) ہے اور اس کا شمار اوسا کا کے جدید ترین اور بہترین رہائشی علاقوں میں ہوتا ہے۔ پُرسکون ہونے کے باوجود دو ریلوے سٹیشن صرف سات آٹھ منٹ کی پیدل مسافت پر ہیں۔ یمادا (Yamada) شمال کی طرف اور منامی سینری (Minami Senri) جنوب کی طرف۔ دونوں کے راستے میں ایک ایک خوبصورت پارک ہے۔ اس لئے یہ مسافت مزید مختصر معلوم ہوتی تھی۔

اس ہوسٹل کے مکیں زیادہ تر نوجوان تھے جو دنیا کے ہر ملک سے آئے ہوئے تھے۔ بیشتر کا تعلق سوشل سائنس سے تھا۔ میرے ہم عمر بہت کم تھے اور فوراً senior citizen کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔

ہر منزل کے لئے علیحدہ واش روم تھے مگر سب غسل خانے نیچے تہ خانے میں تھے۔

●●●

ابھی ہمیں دو تین دن ہوسٹل میں ہی رہنا تھا۔ اگلی صبح ناشتے کے بعد میں نے سوچا کہ نہا لیا جائے۔

میں تولیہ لے کر غسل خانوں میں پہنچ گیا۔ جیسے ہی میں دروازے سے داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک صاحب شیشے کے سامنے کھڑے بال بنا رہے ہیں۔ یہ کوئی قابل ذکر بات نہیں۔ مگر اگلی بات یقیناً قابل ذکر ہے۔ وہ الف ننگے تھے اور انہیں کوئی شرم محسوس نہیں ہو رہی تھی جیسے یہ روزمرہ کا معمول ہو۔ اور یہ ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔ ان کا تعلق کوریا سے تھا اور وہاں یہ طریقہ فطری ہے۔

بعد میں پتہ چلا کہ یہ انداز کوریا تک ہی محدود نہیں۔ جاپان میں بھی ہے۔

سات آٹھ سو سال پہلے کاما کورا دور میں جاپان میں ایسے غسلخانے بنے جن میں بھاپ

سے غسل ہوتا تھا۔ داخلے کی جگہ تنگ ہوتی تھی تا کہ بھاپ ضائع نہ ہو۔ اندر نیم تاریکی اور بھاپ کی وجہ سے دیکھنا مشکل تھا اس لئے نہانے والے کھانس کر دوسروں کو اپنی موجودگی کا پتہ دیتے تھے۔ یہاں مرد عورت اکٹھے نہاتے تھے۔ تین چار سو سال بعد اِیڈو (Edo) دور میں یہ تبدیلی آئی کہ ریاست کے حکم سے مرد و زن کے لئے علیحدہ حصے بنا دیے گئے۔ مگر ہر جگہ اس حکم کا اطلاق نہ ہو سکا۔ درمیان کا رستہ یہ نکالا کہ تالاب میں داخلے کے دو راستے بنا دیے گئے۔ ایک مردوں کے لئے اور ایک عورتوں کے لئے۔ مگر نہاتے وہ ایک ہی تالاب میں تھے۔ آہستہ آہستہ یہ درمیانی راستہ ختم ہو گیا اور حکم پر سختی سے عمل ہونے لگا۔

اب واپس ہوسٹل کے غسل خانے کی طرف چلتے ہیں۔ چلنا کیا وہاں سے نکلتے ہیں۔ یہ منظر میرے لئے نا قابلِ قبول تھا۔ میں الٹے پاؤں پلٹا اور نہانے کا ارادہ کسی مناسب وقت تک ملتوی کر دیا۔ مگر آنے والے دنوں نے بتایا کہ ایسا 'مناسب' وقت کبھی نہیں ملنے والا۔ اس لئے آنکھیں نیچی کر کے ایک غسل خانے میں داخل ہو جاتا اور اسی طرح باہر نکل آتا۔

•••

وہ دن فارغ تھا اور ابھی کسی سے شناسائی بھی نہیں تھی۔ سوچا گھر فون کر لوں۔ کھانے کے کمرے کے باہر برآمدے میں کئی ٹیلیفون بوتھ تھے۔ طریقہ کار یہ تھا کہ ایک ہزار ین یا اس سے بھی زیادہ مالیت کا کارڈ خریدنا پڑتا تھا۔ اس زمانے میں ایک ہزار ین تقریباً ۱۵۰ روپے کے برابر تھے (آج کل ۱۰۵۰ روپے کے برابر ہیں)۔ ان کارڈوں پر جاپان کے خوبصورت قدرتی مناظر کی تصاویر بنی ہوتی تھیں۔ یعنی یہ ایک کلکٹر آئٹم بھی تھا۔ آپ کارڈ مشین میں ڈال کر نمبر گھماتے تھے اور بات کرتے تھے۔ ریسیور رکھتے ہی کارڈ باہر آ جاتا تھا۔ جتنی رقم خرچ ہوئی اس کے مطابق ایک طرف بنے پیمانے پر سوراخ ہو جاتا تھا۔

جاپان میں اپنے پورے قیام کے دوران میں ہفتے میں دو دفعہ گھر فون کرتا تھا۔ مقصد صرف ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرنا ہوتا تھا۔ تفصیلی باتوں کے لئے خط و کتابت تھی۔ ابھی ای میل کا زمانہ نہیں آیا تھا۔

پانچ سالہ قیام کے دوران کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے مقررہ وقت سے پانچ منٹ سے زیادہ دیر کی ہو۔ کسی ناگزیر وجہ سے ایک دفعہ ایسا ہوا تھا کہ مجھے دو گھنٹے کی تاخیر ہو گئی۔ یہ دو گھنٹے

میرے گھر والوں نے خاص طور پر والدہ نے جس پریشانی میں گزارے اس کا بیان ممکن نہیں۔

•••

ان دو چار دنوں میں جن لوگوں سے دعا سلام ہوئی ان میں ہنگری کے ڈاکٹر لازلو، ہندوستان کے ڈاکٹر دوالفقار خان، پرشانت اور سنیل تھے۔ لازلو اور خان صاحب تو میرے ہم عمر تھے، باقی دونوں بیس پچیس سالہ نوجوان تھے۔

خان صاحب تو ہوسٹل کے پرانے مکیں تھے۔ وہ پوسٹ ڈاکٹریٹ کر رہے تھے مگر انہیں یونیورسٹی جاتے کم ہی دیکھا تھا۔ 'غیر نصابی' سرگرمیاں بہت زیادہ تھیں جن کا کچھ ذکر بعد میں آئے گا۔

لازلو صاحب کا ذکر بھی آتا رہے گا۔ ہماری کافی مصروفیات مشترک رہتی تھیں۔

پرشانت کے ساتھ بھی کافی وقت گزرتا تھا۔ اچھا لڑکا تھا۔ ہم ٹیبل ٹینس، ٹینس وغیرہ کھیلتے اور گپ شپ لگاتے۔

سنیل کے بارے میں ایک قابل ذکر بات تھی۔ وقت کا بہت پابند تھا۔ ایک منٹ بھی آگے پیچھے نہیں کرتا تھا۔ مگر تاریخ اکثر بھول جاتا تھا۔ اس وجہ سے اس کے بہت سے دوستی کے رشتے شروع میں ہی ٹوٹ جاتے تھے۔

•••

۳

جاپانی حکومت کی سکولرشپ کی شرائط کے مطابق ہر شخص نے پہلے چھ ماہ جاپانی زبان، کلچر اور تاریخ سے آگہی حاصل کرنی تھی۔اس مقصد کے لئے ہمیں غیر ملکی زبانوں کی یونیورسٹی (جسے جاپانی میں گائی دائی کہتے ہیں) جانا تھا جو خوش قسمتی سے اوساکا میں ہی تھی۔یعنی میں خوش قسمت تھا کہ چھ مہینے بعد مجھے جگہ نہیں بدلنی تھی۔دو چار اور لوگ بھی تھے جو اس خوش قسمتی میں شریک تھے۔ساٹھ ستر ایسے تھے جنہیں کسی اور شہر جانا تھا۔

شمال میں یمادا کے ریلوے سٹیشن سے اگلا اور آخری سٹیشن کیتا سینری (Kita Senri) تھا۔کیتا کا مطلب شمال ہے۔وہاں سے بس ہمیں شمالی پہاڑوں کے بیچ ایک بہت خوبصورت جگہ پہنچاتی تھی جہاں یہ یونیورسٹی تھی۔

ہنگری کا ڈاکٹر لازلو میرا ہم مکتب تھا۔اس نے بھی بعد میں اوساکا میں ہی رہنا تھا۔یعنی ہمارا ساتھ طویل تھا۔وہ انگریزی زبان میں پی ایچ ڈی کر چکا تھا۔اب جاپانی سیکھنے آیا تھا۔کچھ ہم عمری اور کچھ یوں کہیے کہ مزاج مل گئے۔انگریزی میں پی ایچ ڈی ہونے کے باوجود وہ میری انگریزی سے بڑا مرعوب تھا۔

ہماری پہلی کلاس کے جاپانی انسٹرکٹر قابل دید تھے مگر ان کی انگریزی ناقابلِ سماعت تھی۔اس وقت ہماری جاپانی کی صلاحیت صفر تھی۔میں نے لازلو سے کہا:

"Their English is a little better than our Japanese."

وہ بہت محظوظ ہوا اور میرے اس تبصرے کو عرصہ تک یاد رکھا۔

اس یونیورسٹی میں صحیح معنوں میں بین الاقوامی ماحول تھا اور چونکہ اکثریت نوجوانوں کی تھی اس لئے ہر وقت ہلہ گلہ رہتا تھا۔

•••

جاپانی اساتذہ جاپانی زبان پڑھانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ بول چال کی حد تک معاملہ قابو میں تھا مگر لکھنے لکھانے کی حد تک ناممکن تھا کہ چھ مہینے میں کچھ ہاتھ آسکے۔ اس کی بنیادی وجہ ۱۸۰۰ چینی حروف ہیں جنہیں جاپانی میں کان جی (kanji) کہتے ہیں۔ ان کی مکمل پہچان کے بغیر آپ اخبار بھی نہیں پڑھ سکتے۔ ایک جاپانی بچہ انہیں سیکھنے میں چھ سال لگا دیتا ہے (بچوں میں سیکھنے کی صلاحیت بہت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ذہن کی سلیٹ پر ابھی کافی خالی جگہ موجود ہوتی ہے۔)
اگر چہ دو متبادل مجموعہ حروف موجود ہیں جنہیں ہیرا گانا (hiragana) اور کا تا کانا (kata kana) کہتے ہیں مگر کان جی سیکھے بغیر بات نہیں بنتی۔

کان جی یعنی چینی حروف بنیادی طور پر تصاویر ہیں جنہیں دیکھ کر مفہوم اخذ کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چین اگر پچھلے دو تین ہزار سال سے ایک ملک کے طور پر متحد ہے تو اس کی ایک وجہ کان جی بھی ہے۔ مختلف ادوار میں اور اب بھی چین کے کئی حصوں میں بولنے کے لحاظ سے کئی زبانیں رہی ہیں مگر لکھے ہوئے کو سب سمجھ لیتے ہیں۔

جاپان میں ۶۵۰ عیسوی کے لگ بھگ مندروں کی داسیوں نے لکھنے کا ایک نیا طریقہ رائج کیا جس میں دنیا کی باقی زبانوں کی طرح آواز کو بنیاد بنایا گیا۔ اسے ہیرا گانا کہتے ہیں اور اس کے پچاس کے قریب حروف ہیں۔ اس طرح کافی آسانی پیدا ہوگئی۔

جب غیر ملکی اثرات اور الفاظ آئے تو ان کی فوری پہچان کے لئے ایک اور طریقہ وضع کیا گیا۔ اسے کا تا کانا کہتے ہیں۔ سائنسی اصطلاحات بھی اسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں۔

یعنی موجودہ جاپانی رسم الخط کان جی، ہیرا گانا اور کا تا کانا کا مجموعہ ہے۔ جس میں کان جی ابھی بھی پوری طرح حاوی ہے۔

جاپانی زبان کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں کوئی خاموش (silent) حرف نہیں ہوتا نہ ہی ایک ہی حرف کو انگریزی کی طرح مختلف انداز سے بولا جاتا ہے۔

میں نے کچھ اور دلچسپ چیزیں بھی نوٹ کیں۔ مثلاً جاپانی کہتے ہیں کہ بلی 'میاؤں' نہیں 'نیاؤں' کرتی ہے۔ میں نے اپنے طور پر یہ قضیہ سلجھانے کی کوشش کی اور کئی بلیوں کو غور سے سنا مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ کبھی وہ 'میاؤں' کرتی ہیں اور کبھی 'نیاؤں'۔ آپ بھی کوشش کر سکتے ہیں۔

•••

یہ تو جاپانی زبان کا احوال تھا۔ اس کے علاوہ جاپانی تہذیب و تمدن کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ زبان انگریزی تھی اور معلم بھی تعلیم یافتہ تھے۔ خاص بات یہ کہ سب معلم خواتین تھیں جو انگریزی پر عبور رکھتی تھیں۔ یہ کلاسیں دلچسپ ہوتی تھیں۔

انگریزی زبان بولنا جاپانیوں کے لئے مشکل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جاپانی زبان میں مستقبل کا صیغہ نہیں ہے اور نہ ہی prepositions ہیں۔ مگر قدرتی طور پر خواتین اس معاملہ میں بہت بہتر ہیں۔ ان کی بولی ہوئی انگریزی میں روانی ہوتی ہے۔

جاپانی مرد ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولتے ہیں جس طرح کوئی پنجابی ہو جس نے نئی نئی انگریزی بولنی شروع کی ہو۔ مگر انہیں کوئی احساس کمتری نہیں اور نہ ہی وہ منہ بگاڑ بگاڑ کر انگریزوں کی طرح انگریزی بولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے پروفیسر صاحب کہا کرتے تھے کہ کیا امریکن یا انگریز جاپانیوں کی طرح جاپانی بول سکتے ہیں اور کیا کبھی انہوں نے ایسی کوشش کی۔ اگر نہیں تو ہم کیوں کریں۔

ہماری انسٹرکٹر کا نام کوراچی تھا۔ مجھے یہ نام مشکل لگتا تھا اور بار بار بھول جاتا تھا۔ ایک دن اچانک ذہن میں آیا کہ یہ تو کراچی سے بہت ملتا جلتا ہے۔ بیچ میں ایک 'و' ڈال دو اور بس۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا دماغ بعض دفعہ مصنوعی اجنبیت کی دیواریں کھینچ دیتا ہے۔

یہ معاملہ صرف میرے ساتھ نہیں تھا، جاپانیوں کے ساتھ بھی تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ کسی راہ گیر کو کچھ پوچھا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے معذرت کر لی اور چل پڑا۔ اس کا دماغ پہلے ہی فیصلہ دے چکا ہوتا کہ یہ غیر ملکی انگریزی بول رہا ہے۔ دو چار قدم کے بعد اسے احساس ہوتا کہ آواز تو جاپانی زبان جیسی ہے تو وہ رکتا، پلٹتا اور ہم کلام ہوتا۔

میڈم کوراچی دیکھنے میں پچیس تیس سال کی لگتی تھی مگر ایک دن انکشاف ہوا کہ اتنی عمر تو اس کی بیٹی کی ہے۔ منگول نسل کے لوگ پچاس ساٹھ سال کی عمر تک کسی کو پتہ نہیں لگنے دیتے۔ پھر

اچانک زوال آتا ہے اور چند سالوں میں ہی اصل عمر ظاہر ہو جاتی ہے۔

انہوں نے ایک دن ہم سے سوال کیا کہ جاپان کی ترقی کا راز کیا ہے؟

ہر کسی نے طبع آزمائی کی مگر صحیح جواب نہ دے سکا۔ انہوں نے بتایا کہ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جاپان میں ۹۰ فیصد آبادی کا تعلق متوسط طبقے سے ہے۔ میرے بعد کے مشاہدے نے بتایا کہ غریب تو کوئی ہے ہی نہیں۔ باقی ۱۰ فیصد سے مراد امرا تھے۔ مگر وہ بھی دولت کی نمائش نہیں کرتے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑھتا ہے، اوساکا جیسے بڑے شہر میں میں نے دس مرلے سے بڑا مکان نہیں دیکھا۔ ایسے مکانوں کی بھی تعداد زیادہ سے زیادہ ایک ہزار ہو گی۔

●●●

جاپان میں آنے والا ہر شخص اس بدلے ہوئے ماحول سے مناسبت پیدا نہیں کر پاتا تھا۔ اسے دوسرے الفاظ میں cultural shock کہہ لیجیے۔ اس کی انتہائی مثال تو یہ ہے کہ میرے ساتھ جانے والے ایک صاحب چند دنوں بعد ہی بوریا بستر سمیٹ کر اتنے بڑے سکولرشپ کو خیر باد کہہ کر پاکستان واپس آ گئے۔ سب سے مشکل کام بدلی ہوئی خوراک سے سمجھوتا کرنا ہے۔ میرا اپنا وزن پہلے چھ ماہ میں پندرہ کلو کم ہوا۔

میرے گائی دائی کے چھ ماہ کے قیام کے دوران دو تین خودکشی کے واقعات بھی ہوئے۔ یہ سب لڑکیاں تھیں جنہوں نے آٹھ نو منزلہ عمارات سے کود کر جان دے دی تھی۔ اور یہ سب جاپانی تھیں۔ جاپانی اسے باعزت موت سمجھتے ہیں۔ کن مسائل کی وجہ سے انہوں نے یہ انتہائی قدم اُٹھایا، ان پر بعد میں تبصرہ کروں گا۔

شدید سردی تھی۔ یونیورسٹی کے کمروں میں ہیٹر لگے ہوئے تھے مگر چلتے نہیں تھے۔ پتہ چلا کہ یہ صرف ۳۱ مارچ تک چلتے ہیں۔ اس کے بعد چاہے برف بھی پڑے انہیں چلانے کی اجازت نہیں۔

●●●

اسی یونیورسٹی میں میرا تعارف لاہور سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر تبسم کاشمیری سے ہوا۔ وہ اردو زبان کے پروفیسر تھے اور تقریباً دس سال سے اس منصب پر فائز تھے۔ ان کا کافی ذکر رہے گا۔

ڈاکٹر صاحب میرے لئے بہت بڑا سہارا بنے۔ وہ رہنما بھی تھے اور دوست بھی۔ جب بھی دل گھبراتا تھا میں ان کے پاس چلا جاتا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ خوش دلی اور کھلے بازؤں سے میرا استقبال کیا۔

میں تو ۱۹۹۵عیسوی میں واپس آ گیا مگر ڈاکٹر صاحب ۲۰۰۵عیسوی تک اسی یونیورسٹی سے منسلک رہے۔ اپنے بیس سال سے زیادہ قیام میں انہوں نے دیگر کارناموں کے علاوہ اردو جاپانی ڈکشنری کو ترتیب دینے کے عظیم مشن میں کلیدی کردار ادا کیا جس کا جاپانی حکومت نے سرکاری سطح پر اس طرح اعتراف کیا کہ شہنشاہ جاپان کی طرف سے انہیں خصوصی دعوت نامہ ملا اور وہ شاہی محل میں اپنے اعزاز میں دی گئی تقریب میں شریک ہوئے۔ وہاں انہوں نے شاہی خاندان کے ساتھ ضیافت میں شرکت کی۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے جسے حاصل کرنے کا کوئی جاپانی بھی عام طور پر صرف خواب ہی دیکھ سکتا ہے۔ اس لئے ان کے کئی جاپانی مصاحبین کو یقین ہی نہیں آیا۔

اب بھی ڈاکٹر صاحب سے رابطہ ہے مگر مصروفیات ایسی ہیں کہ حالیہ سالوں میں صرف ایک ہی ملاقات ہوئی ہے۔ تاریخ تھی ۲نومبر ۲۰۱۶عیسوی۔ یہ ملاقات ۲۲سال بعد ہوئی مگر بے تکلفی اسی طرح تھی۔ وہ مجھے خود لینے آئے اور دیکھتے ہی کہا:

'واہ ہیرو'۔

ٹھیک ہے میں اپنی صحت کا خیال رکھتا ہوں مگر وہ بھی فٹ تھے۔ فرق یہ تھا کہ میں اب بھی بال کالے کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ وہ عمر کے اس حصے سے گزر چکے ہیں۔

میں ان کے دولت خانے پر گیا۔ کچھ وقت اکٹھے گزارا اور پرانی یادیں تازہ کیں۔ پھر ہم مستنصر حسین تارڑ صاحب سے ملنے چلے گئے۔ دونوں کی ۵۰سال پرانی دوستی ہے۔

میں نے ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ اپنی کتاب 'اڑن کھٹولا' تارڑ صاحب کو پہنچائی تھی جسے انہوں نے پسند فرمایا تھا اور ملاقات کا وقت دیا تھا۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ ہمارے منتظر تھے۔ ہماری گپ شپ کے دوران ان کا فون آیا اور ہمیں نشست مختصر کرنی پڑی۔

میری کتاب تارڑ صاحب کے سامنے تھی۔ کئی صفحوں پر سوالات کے لئے کاغذ رکھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا کہ لگتا ہے کہ آپ نے ساری کتاب پڑھی ہے۔ فرمانے لگے کہ انہوں نے ایک ایک لفظ پڑھا ہے۔ انہوں نے میرے انداز بیاں کی بھی تعریف کی۔ پھر انہوں نے وضاحت

طلب نقاط کے بارے میں سوالات کئے۔ اس کے بعد دائرہ گفتگو پھیلنے لگا اور بہت سے موضوعات پر بات ہوئی۔

تارڑ صاحب کا میں ہمیشہ سے بہت معتقد رہا ہوں۔ چاہے ان کے ٹی وی پروگرام ہوں، ڈرامے ہوں یا تحریریں ہوں۔ ان کے سفرناموں سے تو میں اس حد تک متاثر ہوں کہ ایک دن میں نے اپنے بہت قریبی دوست ڈاکٹر افضل غوری سے کہا کہ میں نے شمالی علاقوں کے بہت سفر کئے ہیں اور تارڑ صاحب کے سارے سفرنامے بھی پڑھے ہیں۔ میں جب کبھی ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہوں تو تصویر گڈمڈ ہو جاتی ہے کہ کون سا سفر میں نے اکیلے کیا ہے اور کون سا تارڑ صاحب کے ساتھ۔ ڈاکٹر غوری نے کہا کہ کبھی موقع ملے تو اپنا تبصرہ تارڑ صاحب تک ضرور پہچانا۔ اب موقع ملا تو میں نے ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ وہ بہت محظوظ ہوئے۔

تارڑ صاحب گفتگو کر رہے تھے اور لگتا تھا کہ علم کا ایک سمندر ہے جو بہتا چلا جا رہا ہے۔ انہوں نے کئی موضوعات پر بے باک گفتگو کی۔ انہوں نے بہت سی نادر کتب بھی دکھائیں جو زیادہ تر انگریزی میں تھیں۔ ان کی اصل شخصیت میرے تصورات سے کہیں زیادہ بلند نکلی۔

وہ ایک گھنٹہ جو میں نے دونوں عظیم شخصیات کی صحبت میں گزارا میری یادداشت کا وہ سرمایہ ہے جو کبھی گم نہیں ہوگا۔

اُٹھتے ہوئے تارڑ صاحب نے تاکید کی کہ میں جب بھی لاہور آؤں ان سے ضرور ملوں۔

بعد میں ڈاکٹر تبسم مجھے کہنے لگے:

'یار تم پہلے شخص ہو جس کے ساتھ تارڑ پہلی ہی ملاقات میں اتنا بے تکلف ہوا ہے۔'

یہ الفاظ میرے لئے کسی اعزاز سے کم نہیں۔

میں نے جب اس ملاقات کا ذکر کیا تو میرا بڑا نواسہ محمد حسن جو اس چھوٹی عمر میں ہی اُردو کتب پڑھنے کا شوقین ہے بہت متاثر ہوا اور ان دونوں شخصیات سے ملنے کی ضد کرنے لگا۔ میری بہن عذرا حمید جس کی وجہ سے میں ادیب بنا، اور میری ہونہار بھتیجی ندا رشید جو کئی بین الاقامی وظائف جیت چکی ہے، بھی بہت کُرید کُرید کر اس ملاقات کی تفصیل پوچھتی رہیں۔

•••

۴

اب واپس ۲۹ سال پرانے جاپان چلتے ہیں۔

جب ہوسٹل اور گائی دائی کے معاملات معمول پر آ گئے تو سوچا کہ اپنے پروفیسر سے ملا جائے۔فون کیا تو کہنے لگے کہ انہیں تو میرے آنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔ میں نے سوچا کہ پروفیسر صاحب حالات حاضرہ سے کتنے بےخبر ہیں۔اتنی بڑی خبر اور انہیں علم ہی نہیں۔

اگلا دن گائی دائی سے چھٹی کا تھا۔کیتا سینری سٹیشن تک میرا راستہ وہی تھا۔وہاں سے گائی دائی جانے کے لئے تو بس سے مزید آدھا گھنٹہ لگتا تھا مگر اوساکا یونیورسٹی کا سویتا (Suita) کیمپس پیدل صرف دس منٹ کے فاصلے پر تھا۔

میں اپنے ریسرچ سینٹر بیکن (Biken) پہنچا اور استقبالیہ پر اپنا تعارف کرایا۔انہوں نے انتظار کا کہا اور پروفیسر صاحب کو فون کر دیا۔

تقریباً پانچ منٹ بعد پروفیسر موری ہیرو متسودا (Morihiro Matsuda) تشریف لائے۔ساڑھے پانچ فٹ کے قریب قد، پتلا جسم، خوش شکل۔عینک نے شخصیت کو بارعب بنا دیا تھا۔تھری پیس سوٹ میں ملبوس، مگر پاؤں میں چپل۔ایسا میں نے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ہندوستان کے جین مذہب کے بارے میں سنا تھا کہ وہ لوگ بھی بہترین لباس پہنتے ہیں مگر ننگے پاؤں چلتے ہیں تاکہ حشرات الارض محفوظ رہیں۔

بعد میں پتہ چلا کہ یہاں وجہ کچھ اور تھی۔ جاپانیوں کی روایت ہے کہ گھر ہو یا کام کرنے

کی جگہ، اپنے جوتے داخل ہوتے ہی اتار کر گھر والے جوتے پہن لیتے ہیں۔ اس طرح باہر کی مٹی اور غلاظت اندر داخل نہیں ہوتی۔ یہ عادت ڈالنے کی بات ہے اور یہ بہت مفید عادت ہے۔

پروفیسر صاحب مسکراتے ہوئے میری طرف بڑھے۔ میں نے یقین کرنے کے لئے کہ کہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہو رہی، آہستہ سے پوچھا:

'پروفیسر موری ہیرو؟'

ناگواری کی ایک لہر ان کے چہرے پر آئی اور گزر گئی۔ دراصل میں نے بہت بڑی گستاخی کر دی تھی جسے انہوں نے مجھے لاعلم سمجھتے ہوئے معاف کر دیا تھا۔

پروفیسر صاحب کا پورا نام موری ہیرو متسودا تھا اور مجھے انہیں پروفیسر متسودا کہہ کر بلانا چاہئے تھا۔ پہلا نام صرف بہت بے تکلف دوست یا گھر والے استعمال کر سکتے ہیں۔ اور ایک طالب علم کا اپنے استاد کو اس طرح مخاطب کرنا تو ناقابلِ تصوّر تھا۔

●●●

ہم لفٹ میں داخل ہوئے اور پانچویں منزل پر اتر گئے جہاں میرا ڈپارٹمنٹ تھا۔

ہم سیدھے کافی روم میں چلے گئے۔ وہاں نو دس لوگ میرے منتظر تھے۔ مجھے اس وقت تک تو اتنی اہمیت کبھی نہیں ملی تھی۔

مجھے ایک لمبی میز کے ایک طرف بٹھا دیا گیا اور دوسری طرف درمیان میں پروفیسر صاحب، ان کی دائیں طرف ایک خاتون، بائیں طرف عینکوں والے ایک صاحب، اور ان تین افراد کے دائیں بائیں ایک ایک اور صاحب بیٹھ گئے۔ اس کے علاوہ تین چار لوگ اِدھر اُدھر پڑی کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔ سامنے میز پر بے شمار چیزیں پڑی تھیں۔ سمجھئے کہ ہائی ٹی کا پورا اہتمام تھا۔

میرا غائبانہ تعارف تو ہو چکا تھا مگر وہ لوگ میرے منہ سے کچھ سننے کے متمنی تھے۔ میں نے اپنے بارے میں کچھ بتایا۔ پوچھا گیا کہ جاپان کیسا لگا۔ میں نے کہا کہ بہت اچھا مگر ابھی کھانے پینے کے کچھ مسائل تھے۔ اس کے بعد سب لوگوں نے اپنا تعارف کرایا۔

یہ قدرتی بات تھی کی جو خاتون پروفیسر کے دائیں طرف تھیں، میں نے انہیں پروفیسر صاحب کے بعد سب سے سینئر سمجھا۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ وہ صرف شیشے کا سامان دھونے آتی

ہیں۔ جو صاحب بائیں طرف تھے وہ ایسوسی ایٹ پروفیسر تھے اور دوسرے نمبر پر تھے۔ انہوں نے بعد میں مجھے بتایا کہ پروفیسر صاحب کے نزدیک وہ خاتون سب سے اہم تھیں۔ اساتذہ میں سے کوئی چھوڑ جاتا تو انہیں متبادل مل جاتا تھا۔ مگر کسی وجہ سے وہ خاتون ناراض ہو کر چلی جاتیں تو سب کو مصیبت پڑ جاتی۔ ان کا متبادل ملنا بہت مشکل تھا۔ اس لئے انہیں اتنی اہمیت دی جاتی تھی۔

باقی دو حضرات اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ اس کے علاوہ ایک خاتون سیکریٹری تھی اور دو چینی میاں بیوی میری طرح طالب علم تھے۔

جب ان 'رسومات' سے فارغ ہو چکے تو باقی لوگ چلے گئے اور صرف میں اور پروفیسر صاحب رہ گئے۔ اب کام کی باتیں شروع ہوئیں۔

پروفیسر صاحب کہنے لگے:

'تم جتنی چاہے کوشش کر لو تمہیں جاپانی زبان نہیں آنی۔ اور پھر پی ایچ ڈی کے لئے اس کی ضرورت بھی نہیں۔ اس لئے اس پر دماغ نہ کھپاؤ اور فارغ وقت میں ڈیپارٹمنٹ آنا شروع کر دو۔'

بات ان کی سولہ آنے صحیح تھی مگر میں ابھی سے پابند نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں نے بیچ کی راہ نکالی اور ہفتے میں ایک دن وہاں جانا شروع کر دیا تاکہ معمولات سے آگاہی ہو جائے اور جب میں چھ مہینے بعد وہاں جاؤں تو فوری طور پر کام شروع کر سکوں۔

●●●

اب مجھے ایک اچھے کیمرے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ڈاکٹر تبسم سے مدد کی درخواست کی۔ کہنے لگے کہ چھٹی والے دن اوساکا شہر چلیں گے۔ سیر بھی ہو جائے گی۔

ہم شہر کے شمالی مضافات میں رہتے تھے۔ میرا ہوسٹل، ڈاکٹر صاحب کا گھر اور دونوں یونیورسٹیاں سینری کے علاقے میں تھیں۔

●●●

اوساکا شہر کی سیر سے پہلے اس کا کچھ تعارف تو ہونا چاہئے۔

اوساکا جاپان کا دوسرا بڑا شہر ہے اور صنعتی لحاظ سے سب سے اہم۔ یہ ہونشو کے مغربی حصے میں واقع ہے۔ تاریخی نوعیت کے اہم شہر کیوٹو (Kyoto) اور نارا (Nara) قریب ہی ہیں۔ مشہور بندرگاہ کوبے (Kobe) بھی کچھ ہی دور ہے۔

۶۴۵ عیسوی میں شہنشاہ کوتو کو (Kotoku) نے یہاں نانیوا (Naniwa) محل تعمیر کرایا، اس شہر کو دارالخلافہ قرار دیا اور اس کا نام نانیوار کھ دیا (قدیم عراق میں بھی اس نام کا ایک شہر تھا)۔ ۷۴۵ عیسوی میں نارا کو دارالخلافہ بنا دیا گیا۔ مشہور زمانہ اوساکا قلعہ کی تعمیر ۱۵۸۳ عیسوی میں شروع ہوئی۔

جاپان کی تاریخ تین شہروں اوساکا، نارا اور کیوٹو کے گرد گھومتی ہے۔ ٹوکیو تو تین ساڑھے تین سو سال پہلے تعمیر ہوا۔

تاریخی طور پر اوساکا ہمیشہ تجارت کا مرکز رہا۔ اس کے مکینوں کی خوش حالی اور خوش خوراکی کی وجہ سے ٹوکیو والے یہ طعنہ دیتے ہیں:

'اوساکا والے اس وقت تک کھاتے رہتے ہیں جب تک گر نہ جائیں۔'

جواب میں اوساکا والے ٹوکیو والوں کو جنگلی کہتے ہیں۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ٹوکیو شہر بننے سے پہلے اس علاقے میں ڈاکو اور جرائم پیشہ لوگ رہتے تھے۔

نانیوا کی بجائے اوساکا کا نام پہلی دفعہ ۱۴۹۶ عیسوی میں استعمال ہوا۔ اس کا مطلب 'بڑی ڈھلوان' ہے۔ اس شہر کا شمالی حصہ کافی بلند ہے اور یہ شہر ڈھلوان کی صورت میں سمندر تک پہنچتا ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً سوا دو سو مربع کلومیٹر ہے اور ۲۰۰۵ عیسوی میں آبادی تیس لاکھ تھی۔ شہر میں ۷۶۰ نہریں ہیں اور بے شمار پل۔

شہر کے دو بڑے حصے ہیں، شمالی اور جنوبی۔ شمالی حصہ کا مرکز امیدا (Umeda) اور جنوبی حصہ کا نامبا (Namba) ہے۔

•••

اب تک میں نے ہر طرف ہین کیو (Hankyu) کا لفظ دیکھا تھا، ٹرین بھی ہین کیو، بس بھی ہین کیو، ڈیپارٹمنٹل سٹور بھی ہین کیو۔ کبھی اس طرف توجہ نہیں دی تھی کہ ایسا کیوں ہے؟

جب میں ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ کیتا سینری سے روانہ ہوا کر امیدا پہنچا تو آنکھیں کھلیں۔ ریلوے سٹیشن کے بیشمار پلیٹ فارم تھے۔ یہ ہین کیو کا ہی ریلوے سٹیشن تھا اور اوساکا کے شمالی علاقے کا مرکزی ریلوے سٹیشن۔ چھوٹے چھوٹے سٹیشنوں پر بھی پورا انظام خودکار تھا تو یہاں تو ہونا ہی تھا۔ آپ اپنی منزل کا تعین کرتے، مشین میں پیسے ڈالتے، وہ خود ہی حساب لگا کر ٹکٹ اور

باقی رقم اگل دیتی۔ اسی طرح پلیٹ فارم پر داخلے اور باہر نکلنے کا نظام خود کار تھا۔ آپ مشینوں کو دھوکا نہیں دے سکتے تھے۔

اس دور میں ہی جاپان کا ریلوے نظام دنیا کا بہترین نظام تھا۔ آپ کہیں بھی ہوں، پانچ منٹ یا اس سے کم کی پیدل مسافت کے بعد کسی نہ کسی ریلوے سٹیشن پر پہنچ جاتے تھے اور وہاں سے ٹرینیں بدلتے ہوئے جاپان کے کسی بھی کونے میں پہنچ سکتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انیسویں صدی کے آخر میں بڑے شہروں کی تعمیر نو شروع ہوئی تو ریل کے نظام کو مرکزی حیثیت دی گئی۔

اور یہ سفر اتنا محفوظ ہے کہ ایک دس بارہ سال کی لڑکی بھی اسے بلا خوف وخطر اختیار کر سکتی ہے۔

●●●

ہم سٹیشن سے باہر آئے تو ہر طرف چالیس پچاس منزلہ عمارتیں قطار اندر قطار کھڑی تھیں۔ یہ ٹوکیو کے گنزا (Ginza) کے بعد جاپان کا سب سے مہنگا علاقہ ہے جہاں زمین فٹوں میں ناپی جاتی ہے۔

ہم کچھ دور چلے تو ہمیں ہر طرف ہین کیو کی بجائے ہانشن (Hanshin) کی چھاپ نظر آئی۔ ریلوے سٹیشن بھی، بسیں بھی، ڈپارٹمنٹل سٹور بھی۔ ڈاکٹر صاحب سے استفسار کیا تو انہوں نے بڑی دلچسپ بات بتائی۔

ہین کیو اور ہانشن بہت بڑی کمپنیاں تھیں۔ انہیں اور اسی طرح کی کچھ اور کمپنیوں کو جدید شہر کے مختلف حصے بانٹ دیے گئے تھے اور مکمل انتظام سونپ دیا گیا تھا۔ انہوں نے ہر روٹ پر بسیں اور ٹرینیں چلائی تھیں اور ایک مقررہ وقفے کے بعد۔ مسافر ہوں یا نہ ہوں۔ اکثر ایسی بسیں مل جاتی تھیں جن میں ایک دو سے زیادہ مسافر نہیں ہوتے تھے۔ کچھ تو مصروف روٹوں کی آمدنی سے یہ نقصان پورا ہو جاتا تھا مگر اصل کمائی ڈپارٹمنٹل سٹوروں سے ہوتی تھی جہاں ہر وقت بھیڑ لگی رہتی تھی۔

یعنی کل ملا کر یہ بہت فائدہ کا سودا تھا۔ یہ win win والی صورت حال تھی۔ شہریوں کو بہترین سہولتیں مل جاتی تھیں اور حکومت انتظامی جھنجھٹ سے بچ جاتی تھی۔ مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارے ہاں بھی یہ ماڈل کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے معاشرے کا بحیثیت مجموعی ایماندار ہونا ضروری ہے۔ بدقسمتی سے ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے۔

ہم نے امیدا کے علاقے کی کافی سیر کی اور ڈاکٹر صاحب اپنے ایک جاننے والے کی کیمروں کی دوکان پر لے گئے۔اس زمانے میں autofocus بھی نئی چیز تھی۔میں نے Canon کا Autoboy کیمرہ خریدااور اپنی فوٹوگرافی کا آغاز ڈاکٹر صاحب کی تصویر سے کیا۔

●●●

امیدا کی ایک وجہ شہرت امیدا سکائی بلڈنگ (Osaka sky building) ہے جس کے چالیس منزلہ اونچے دو حصے ہیں جو آپس میں ایک پل کے ذریعے جڑے ہوئے ہیں۔یوں تو اوساکا میں اس سے زیادہ بلندی والی دو درجن عمارتیں ہوں گی مگر وہ یا تو تجارتی مقاصد کے لئے ہیں یا رہائشی ضرورت کو پورا کرتی ہیں۔اوساکا سکائی بلڈنگ صرف تفریحی مقاصد کے لئے ہے۔اس کی چھت پر ایک باغ ہے جہاں دوربینیں بھی لگی ہوئی ہیں جبکہ گراؤنڈ فلور پر بھی ایک جدید باغ ہے جس میں پگڈنڈیاں ہیں اور چشمے بہتے ہیں۔اس کے علاوہ ایک بازار بھی ہے جس میں داخل ہوں تو لگتا ہے جیسے سو سال پرانے جاپان کے کسی بازار میں آ گئے ہوں۔

●●●

۵

بریلی ہندوستان کے ڈاکٹر ذوالفقار خان صاحب سے گپ شپ رہتی تھی۔ اہلِ زبان ہونے کے ناتے بہت شستہ اردو بولتے تھے۔ شروع شروع میں تو ہمیشہ کہتے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو کوئی مسئلہ نہیں۔ برابری کی بنیاد پر رہتے ہیں بلکہ لگتا کہ وہ ہندوؤں سے زیادہ اپنے ملک کی تعریف کرتے تھے۔ مگر جوں جوں بے تکلفی بڑھتی گئی انہوں نے صاف گوئی سے کام لینا شروع کر دیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی جو تصویر انہوں نے کھینچی وہ اس سے کہیں زیادہ اندوہناک تھی جو میرے علم میں تھی۔ ان کا واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

ہمارے کمروں کے درمیان دو اور کمرے تھے۔ میرا کمرہ پہلے آتا تھا اس لئے خان صاحب کے مہمانوں کا کچھ اندازہ ہو جاتا تھا۔ یونیورسٹی وہ کم ہی جاتے تھے۔ زیادہ وقت ایک جاپانی لڑکی فوکو سے دوستی نباہنے میں گزر جاتا تھا۔ وہ عمر میں کم از کم دس سال چھوٹی تھی۔

دونوں شادی کرنا چاہتے تھے مگر لڑکی کے بھائیوں کو یہ رشتہ ناگوار تھا۔ وہی پرانی کہانی تھی۔ کئی دفعہ وہ خان صاحب کے کمرے میں آتے اور دھمکیاں دے کر چلے جاتے۔ ان کے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ خان صاحب مرعوب ہو جاتے اور ارادہ بدل لیتے۔ ورنہ نہ تو جاپان میں لڑکے کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ نہ ہی اغوا۔ اور نہ ہی پھینٹی لگائی جا سکتی ہے۔ اور جب لڑکی بھی ضدی ہو تو اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ مگر خان صاحب ثابت قدم تھے۔ ڈٹے رہے۔

۱۰ جون ۱۹۸۸ عیسوی کو خان صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے:

'کل آپ کو میرے ساتھ کیوٹو چلنا ہے۔ میرا نکاح ہے اور آپ گواہ ہوں گے'۔

خان صاحب نے لڑکی کو مسلمان کر لیا تھا اور نکاح کے لئے ظاہر ہے گواہوں کی ضرورت تھی۔ ایک گواہ انہیں اپنے ایک ساتھی ڈاکٹر مسرت کی صورت میں مل چکا تھا۔

اگلے دن خان صاحب مجھے لے کر روانہ ہوئے۔ میرے لئے سب راستے اجنبی تھے۔ مختلف ٹرینیں بدلتے ہوئے ہم تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد کیوٹو پہنچے۔ وہاں ہم نے ٹیکسی لی۔ خان صاحب کی جاپانی بہت اچھی تھی اس لئے کوئی مشکل نہیں تھی۔ میرے پروفیسر صاحب مجھے مذاق میں کہا کرتے تھے کہ جاپانی زبان سیکھنی ہے تو کسی جاپانی لڑکی سے دوستی کر لو۔ اس فارمولے کی کامیابی کا خان صاحب منہ بولتا ثبوت تھے۔

آخر کار ہم منزلِ مقصود تک پہنچ گئے۔ سیڑھیاں چڑھے اور خان صاحب نے ایک دروازے پر دستک دی۔ دروازے کے باہر تختی لگی ہوئی تھی:

'Poor man's house"

اور نیچے'ڈاکٹر صالحی، افغانستان' تحریر تھا۔

خان صاحب ڈاکٹر صالحی کا غائبانہ تعارف کرا چکے تھے۔ صدر داؤد کی حکومت کے خاتمے کے بعد وہ افغانستان سے بھاگے تھے اور ابھی تک کہیں پاؤں جمانے میں ناکام تھے۔

دروازہ کھلا اور ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے ہمارا استقبال کیا۔ پینتالیس سال کے قریب عمر، درمیانہ قد اور سرانکل سرگم سے مشابہہ۔

ہم گھر میں داخل ہوئے تو غربت کے کوئی آثار نہیں تھے۔ میں نے بائیں طرف دیکھا تو فرش سے عرش (کمرے کی چھت) تک ایک وسیع الماری تھی جو شراب کی بوتلوں سے بھری ہوئی تھی۔

انہی ڈاکٹر صالحی صاحب نے نکاح پڑھانا تھا۔ میں اس پر کیا تبصرہ کروں۔ ڈر یہی تھا کہ کہیں دو چار گھونٹ پینے کے بعد نہ نکاح پڑھانا شروع کریں۔ مگر خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔

ان کے گھر میں ایک جاپانی خاتون، فوکو کی ایک سہیلی اور ڈاکٹر مسرت پہلے ہی موجود تھے۔ ڈاکٹر صالحی نے نکاح پڑھایا، باقی رسومات ہوئیں اور اس طرح خان صاحب اور فوکو رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

یہ کہنا مناسب ہوگا کہ خان صاحب پرائے گھر کے ہو گئے۔ اب وہ اپنی بیوی کے

رحم و کرم پر تھے۔

جاپانی لڑکیاں غیر ملکیوں سے خاص طور پر غریب ممالک کے افراد سے شادی کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتیں۔ اس طرح انہیں ایسا شوہر مل جاتا ہے جو ہمیشہ ان کا مرہون منت رہے گا۔ وہ جاپان میں تب ہی رہ سکے گا اگر وہ چاہیں گی۔ رشتہ ٹوٹا تو قانونی حیثیت ختم۔ دوسرا وہ اتنا محنتی نہیں ہوگا کہ رات کو گیارہ بجے گھر آئے اور صبح سات بجے گھر سے نکل جائے۔ اس طرح وہ گھر کو زیادہ وقت دے سکے گا۔

●●●

اس زمانے میں اوساکا میں پاکستانی نہ ہونے کے برابر تھے۔ ٹوکیو میں تو لیبر کلاس کافی تھی مگر جو پاکستانی اوساکا پہنچتا تھا عموماً تاجر ہی ہوتا تھا۔ وہ بھی قالینوں کا تاجر۔ جاپان میں پاکستانی قالینوں کی کافی مانگ تھی۔ یہ لوگ بھی اپنے قیام کے دوران پاکستانیوں کو ڈھونڈتے ہوئے ہمارے یا دوسرے ہوسٹلوں تک پہنچ جاتے تھے۔

ندیم بھی ایک ایسا ہی نوجوان تھا۔ اس کا تعلق کراچی سے تھا۔ ہمارے ہوسٹل آیا اور مجھ سے ملاقات ہوئی۔ ہمارے مزاج ملتے تھے۔ ملاقاتیں بڑھیں اور ہم اکٹھے سیر کے پروگرام بنانے لگے۔

پروفیسر صاحب کے فارمولے پر اس نے بھی دل و جان سے عمل کیا تھا۔ خوش شکل تھا، اچھا لباس پہنتا تھا، بات کرنے کا سلیقہ جانتا تھا، اس لئے اسے دوستی قائم کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔

میں ڈاکٹر تبسم کے ساتھ امیدا تک تو ہو آیا تھا مگر ابھی قدیم اوساکا شہر یعنی نامبا (Namba) اور اس کے اردگرد کے علاقے جو جنوب میں سمندر کے کنارے واقع ہیں، اجنبی تھے۔

ایک دن ہم نے وہاں جانے کا پروگرام بنایا۔ نامبا میں تین مقامات مشہور ہیں۔ شن سائی باشی (Shinsaibashi)، دوتونبوری (Dotonburi) اور نپون باشی (Nipponbashi)۔

ہماری پہلی منزل شن سائی باشی (Shinsaibashi) تھی۔ یہ اوساکا کا سب سے بڑا اور مشہور بازار ہے۔ یہ چھت سے ڈھکا ہوا ہے اور یہاں سے کوئی بھی چیز خریدی جا سکتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ آپ کی جیب اجازت دیتی ہو۔ ہماری جیب کی حالت اتنی مستحکم نہیں تھی اس لئے جی بھر کے

ونڈو شاپنگ کی کہ اس پر کچھ خرچ نہیں آتا تھا۔

یہاں سے طبیعت سیر ہوئی تو دوتنبوری کا رخ کیا۔ وہاں ہم مغرب کے وقت پہنچے۔ دن کے وقت وہاں جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہاں کی دلچسپی بہت بڑے بڑے نیون سائن بورڈ، ہر قسم کے ریسٹورنٹ اور جواخانے ہیں۔ یعنی ایک لحاظ سے یہ عیاشی کی جگہ ہے۔ ایک نہر ہے جس کے دونوں طرف ریسٹورنٹ وغیرہ ہیں۔ نہر میں دورویہ فوارے لگے ہوئے ہیں جو مختلف رنگوں میں اپنی بہار دکھاتے ہیں۔

نہر کے پل پر کھڑے ہو کر ایک نظر میں پورے علاقے کا مشاہدہ ہو جاتا ہے۔

یہاں کی کچھ چیزیں پورے اوساکا کی پہچان ہیں۔ ان میں سب سے مشہور گلیکو مین (Glicoman) ہے جو ۱۹۳۵عیسوی سے ایک چار پانچ منزلہ بلند ایتھلیٹ کی شکل میں کھڑا ہے۔ گلیکو جاپان کی سب سے مشہور چاکلیٹ اور ٹافیاں بنانے والی کمپنی ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً اسی قامت کا ایک ڈرم بجاتا مسخرہ ہے جو ۱۹۵۰عیسوی سے اس جگہ براجمان ہے۔ تیسری مشہور چیز ایک ریسٹورنٹ کے باہر آویزاں بیس فٹ لمبا الیکٹرونک کیکڑہ ہے جو باقاعدہ اپنی ٹانگیں ہلاتا ہے۔ اس کے علاوہ بیشمار انواع واقسام کے سائن بورڈ ہیں جو دلچسپی کا باعث ہیں۔ ان تمام روشنیوں کا متحرک عکس دوتنبوری نہر میں بہت دلفریب منظر پیدا کرتا ہے۔

اس جگہ مغرب کے بعد ایک جشن کا سماں ہوتا ہے۔ زیادہ تر نوجوان ہی ہوتے ہیں اور نوجوانوں والی حرکتیں عام ہوتی ہیں۔

ہم نے وہاں ایک گھنٹہ گزارا۔ جب ہم باہر نکل رہے تھے تو ایک چیز دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ ایک ریسٹورنٹ کے باہر انگریزی اور اردو میں لکھا ہوا تھا:

'یہاں پاکستانی کھانا دستیاب ہے۔'

میں نے سوچا یہاں پاکستانی تو ہوتے نہیں پھر ان کے لئے ریسٹورنٹ؟

اندر جھانکا تو سب جاپانی ہی نظر آئے۔ ہمیں تو یہی تاثر ملا کہ وہ لوگ پاکستانی کھانا پسند کرتے ہیں۔ اردو کا بورڈ اکادکا انگریزی سے نابلد پاکستانی کے لئے تھا۔

اسی شام میں نے جاپان میں پہلی اور آخری بار غربت کی جھلک دیکھی۔ ایک خستہ حال بوڑھا، جس نے انتہائی بوسیدہ اور میلے کپڑے پہنے ہوئے تھے، ایک ریڑھے پر ضائع کیے ہوئے

گتے ڈال کر لے جار ہا تھا۔

•••

اب ہمیں نیون باشی جانا تھا جسے عرف عام میں Den Den Town بھی کہتے ہیں۔ یہ جگہ بجلی کی مصنوعات کے لئے مشہور ہے۔اس کے علاوہ میوزک،فوٹوگرافی وغیرہ کی بڑی دوکانیں بھی یہیں پر ہیں۔ ہم ونڈو شاپنگ کرتے رہے کہ ان چیزوں کوخریدنے کی سکت نہیں تھی۔ جدید ترین ٹی وی سیٹ،ٹیپ ریکارڈر، ریفریجریٹر،فریزر وغیرہ ہرطرف دعوت خرید دے رہے تھے مگر ان کی قیمت لاکھوں میں تھی۔

یہاں یہ بتاتا چلوں کہ مشہور جاپانی کمپنیاں مثلاً سونی،نیشنل پیناسونک وغیرہ چار مختلف معیار کی اشیا بناتی ہیں۔سب سے بہترین مال جاپان میں ہی فروخت ہوتا ہے۔اس لئے کہ صرف جاپانیوں کے پاس ہی اتنی قوت خرید ہوتی ہے کہ اسے خرید سکیں۔ دوسرے درجہ کی چیزیں امریکہ اور یورپ جاتی ہیں۔تیسرے درجہ کی مشرق وسطیٰ اور چوتھے درجہ کی پاکستان، ہندوستان اور تیسری دنیا کے دوسرے ممالک کا مقدر بنتی ہیں۔

میں نے جو چیزیں جاپان سے خریدیں، بیس بائیس برس گزرنے کے باوجود صحیح کام کر رہی ہیں اور کبھی کوئی نقص نہیں پڑا۔

کیمروں کی دوکانوں میں بھی بہت مہنگے مہنگے کیمرے تھے مگر اصل مہنگی چیزیں وہ بڑے بڑے لینز تھے جو اکثر کھیل کے میدانوں میں فوٹوگرافروں نے اپنے کیمروں کے آگے لگائے ہوتے ہیں۔وجہ ایک ہی ہے۔ digital magnification کبھی بھی optical magnification کا متبادل نہیں ہوسکتی۔

یہاں سیکنڈ ہینڈ برقی اشیا کی دوکانیں بھی ہیں جہاں چیزیں جھوٹ بولنے کی حد تک سستی مل جاتی ہیں۔ بہترین حالت والا ٹی وی سات آٹھ ہزار ین (اس زمانے کے مطابق ایک ہزار روپیہ) میں دستیاب ہوتا ہے۔ یہ چیزیں کہاں سے آتی ہیں؟ یہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔

میں جب پیر کے دن ہوسٹل سے یونیورسٹی جاتا تھا تو ہر گھر کے باہر فرنیچر، ٹی وی سیٹ وغیرہ نکال کر رکھے ہوتے تھے کہ جس کا جی چاہے لے جائے۔ان دوکانداروں کے پاس یہ چیزیں یہیں سے آتی تھیں۔انہیں بس ٹرانسپورٹ کا خرچہ پڑتا تھا۔کئی غیر ملکی بھی یہ چیزیں اٹھا کر کے لے

جاتے تھے۔

ایسا کیوں ہوتا تھا؟ وجہ یہ کہ عام جاپانی گھر چھوٹا ہوتا ہے اور اس میں ایک ایک انچ کا حساب رکھنا پڑتا ہے۔ نیا ماڈل status symbol ہے۔ اس نے آنا ہے تو پرانے کو جگہ چھوڑنی ہی پڑے گی۔

ایک دفعہ میرے ایک پروفیسر ڈاکٹر سوگی موتو نے کہا کہ جاپانیوں کی زندگی بہت پھیکی ہے۔ چھوٹے چھوٹے گھر۔ کھڑکی کھولو تو سیمنٹ کی دیواریں۔ پورے سال میں تین چار چھٹیاں ہی ملتی ہیں جن کی پلاننگ سارا سال ہوتی ہے۔ اس ماحول میں تفریح کا ایک ہی ذریعہ ہے۔ نئے ماڈل کی چیزیں لے آئیں اور ان سے دل بہلائیں۔ جب دل بھر جائے تو نکال باہر کریں اور نیا ماڈل لے آئیں۔

●●●

ایک دوکان پر مجھے بہت معقول قیمت میں سیکنڈ ہینڈ ٹی وی نظر آئے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور ایک ٹی وی اپنے کمرے کے لئے خرید لیا۔ وہ بھاری تھا مگر ہم دو تھے۔ ہاتھ بٹاتے ہوسٹل تک لے ہی آئے۔

مگر اس دوران میرا بٹوہ کہیں رہ گیا۔ اس میں پیسے تو زیادہ نہیں تھے مگر ضروری کاغذات تھے۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ صبر کیا اور کاغذات دوبارہ بنانے کی پلاننگ کرنے لگا۔

اگلا دن اتوار تھا اور میں سویا ہوا تھا۔ اچانک میری آنکھ کھلی تو اندازہ ہوا کہ ہوسٹل کے لاؤڈ سپیکر پر میرا نام پکارا جا رہا ہے اور تلقین کی جا رہی ہے کہ استقبالیہ پر آؤں۔ میں پریشان ہو گیا کہ خدانخواستہ کیا معاملہ ہے۔

جیسے ہی میں استقبالیہ پر پہنچا میرا بٹوہ میرے استقبال کے لئے موجود تھا۔ اس بٹوے میں میرے ہوسٹل کا پتہ ایک کاغذ پر لکھا ہوا تھا۔ جس کو بھی یہ بٹوہ ملا، اس نے پتہ نہیں کہاں سے سفر کرتے ہوئے اسے ہوسٹل تک پہنچایا۔ کیا پاکستان میں آپ اس چیز کا تصور کر سکتے ہیں؟

میرے ایک دوست کے جاپانی پروفیسر نے ایک دن کہا کہ ہم جاپانی کلمہ گو نہیں۔ اس کے علاوہ ہم نے اسلام کی ہر چیز اپنا لی ہے۔ ایمانداری، عدل، صداقت اور سماجی برابری۔ تم لوگ اسلام کے نام لیوا ہو اور اس پر جان دینے کو فوراً آمادہ ہو جاتے ہو مگر جو اصل تعلیمات ہیں ان میں

سے ایک پر بھی عمل نہیں کرتے۔

افسوس یہ ہے کہ ہماری حالت مزید بگڑتی جا رہی ہے۔ نہ صرف جاپان میں بلکہ تمام ترقی یافتہ ممالک میں آپ کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو سچ سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ لوگ خود جھوٹ نہیں بولتے اور یہی ان قوموں کی ترقی کی ایک بڑی وجہ ہے۔ ہمارے ہاں جو شخص دوسرے کی بات کو سچ سمجھتا ہے اور اعتبار کرتا ہے اسے سادہ لوح سمجھا جاتا ہے۔ اور وہ اکثر دھوکا کھا جاتا ہے۔

●●●

۶

۱۳/اور ۱۴/جون ۱۹۸۸ عیسوی کو گائی دائی کی طرف سے تفریحی دورہ ترتیب دیا گیا۔ ہمیں کیوٹو کے نزدیک امانو ہاشی داتے (Amano Hashidate) اور جاپان کے مشہور ترین قلعے ہی مے جی (Himeji) کو دیکھنے جانا تھا۔ راستے میں آزوشی (Azushi) نامی گاؤں بھی تھا۔

جن لگژری بسوں میں ہمیں سوار کیا گیا وہ آج بھی پاکستان میں نہیں ہیں۔ کم از کم میں نے نہیں دیکھیں۔ البتہ کچھ اور ممالک میں ضرور دیکھی ہیں۔

دو بسوں میں ہم تقریباً ستر لوگ تھے۔ ہم اوسا کا سے روانہ ہوئے تو شام تک ایک ہوٹل پہنچ گئے۔ بہت ہی پرسکون پہاڑوں میں گھرا علاقہ تھا۔ شام ڈھلتے ہی بے حد پرتکلف کھانا لگا دیا گیا۔ درخواست کی گئی کہ ہم الماری میں موجود جاپانی لباس کی مونو (Kimono) پہن لیں۔

فرش سے چھ انچ اونچی میزیں تھیں اور ان کے دونوں طرف ہمیں تاتامی (tatami) پر بیٹھنا تھا۔ تاتامی کا جاپانی کلچر میں بہت عمل دخل ہے۔ یہ ایک چٹائی ہے جو چاول کے بھوسے سے بنتی ہے۔ مگر آج کل فوم اور چپ بورڈ بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ ہر جاپانی گھر میں پائی جاتی ہے۔

کھانے میں مچھلی کی مختلف انواع تھیں۔ کئی قسم کے اچار اور چٹنیاں بھی تھیں۔ اور دو تین قسم کے سوپ تھے۔ ہندوؤں والا تھالی کلچر تھا۔ یعنی ہر شخص کے سامنے چھوٹے چھوٹے انتہائی نفیس برتنوں میں ایک پورا سیٹ موجود تھا۔ یہ نہیں کہ بڑے برتنوں سے چیزیں لے کر استعمال کی جائیں۔

کھانا کافی لذیذ تھا اور چونکہ مچھلی تھی اس لئے بے جھجک ہو کر کھایا۔

کھانے کے بعد کلچرل شو ہوا جس میں ہر ملک کے طلبا نے اپنے ملک کی موسیقی یا رقص پیش کئے۔ یہ سلسلہ رات دیر تک چلتا رہا۔

اپنی عادت کے مطابق میں صبح جلد اٹھ گیا۔ کھڑکی سے باہر جھانکا تو زبردست نظارہ تھا۔ سمندر اور اس کے کنارے پہاڑ۔ باہر نکلا اور گرد و نواح کا چکر لگایا۔

صبح ناشتے کے بعد ہم امانو ہاشی داتے کی طرف روانہ ہوئے۔ جاپانیوں کے لئے یہ بہت مقدس جگہ ہے۔ جاپانی دیو مالا کے مطابق دیوتاؤں نے یہیں کھڑے ہو کر جزائر جاپان کو تخلیق کیا تھا۔

یہاں پر ایک جگہ سے نظر آنے والے منظر کو جاپان کے تین حسین ترین قدرتی مناظر میں شمار کیا جاتا ہے۔ دراصل یہ زمین کا ایک پتلا سا ٹکڑا ہے جو میازو خلیج (Miyazo bay) کے دو کناروں کو آپس میں ملاتا ہے۔ اس کی لمبائی ساڑھے تین کلومیٹر ہے اور اس پر سات ہزار پائن کے درخت ہیں۔

ہم کیبل کاروں میں بیٹھے ان درختوں کے اوپر سے ہوتے ہوئے اس جگہ پہنچے جو اس کی وجہ شہرت ہے۔ بہت وسیع اور خوبصورت منظر تھا جس میں سمندر، زمین اور ہریالی کا شاندار امتزاج تھا۔ وہاں دوربینیں بھی لگی ہوئی تھی۔ یہ تو عام بات تھی۔ مگر خاص بات یہ تھی کہ وہاں سیمنٹ کے پلیٹ فارم بنے ہوئے تھے جن پر دونوں پاؤں رکھ کر، کمر جھکا کر، ٹانگوں کے بیچ میں سے یعنی سر الٹا کر دیکھا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس طرح منظر کا حسن دو چند ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی آزمایا مگر کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوا۔

وہاں کچھ وقت گزار کر ہماری بسیں پھر حرکت میں آئیں اور ہم ازوشی پہنچے جس کی پہچان ایک مرکزی گھنٹہ گھر تھا۔

یہ ایک چھوٹا سا بہت ہی پُرسکون قصبہ تھا۔ بہت ہی صاف ستھرا۔ تھوڑی سی آبادی مگر زندگی کی ہر سہولت موجود۔ ہر طرف وینڈنگ (vending) مشینیں نظر آ رہی تھیں۔ پیسے ڈالو اور پسندیدہ چیز کا بٹن دباؤ۔ بقیہ ریزگاری اور مطلوبہ چیز کھٹ سے باہر آ جاتی تھی۔ جس طرح بڑے شہروں میں ہر جگہ یہ مشینیں ملتی تھیں، یہاں بھی تھیں۔ فلسفہ یہ ہے کہ نہ دوکان کے لئے علیحدہ جگہ کی

ضرورت نہ عملے کی ضرورت۔ بس کسی مناسب جگہ مشین رکھ دی (اس کا بھی معمولی سا کرایہ ہوگا) اور ایک کارندہ روز یا ایک دو دن کے وقفے سے آیا اور خالی مشینوں کو پھر سے بھر دیا۔

اس پُرسکون اور خوبصورت پہاڑی قصبے کو دیکھ کر مجھے علامہ اقبال کا شعر یاد آیا:

مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

مجھے یقین ہے وہ یہاں تشریف لاتے تو اس جگہ کو ضرور پسند کرتے۔

●●●

ہمیں ازوشی کے ایک سکول میں لے جایا گیا۔ غالباً اس قصبے میں رکنے کا مقصد بھی یہی تھا۔

سکول میں بچے اور اساتذہ ہمارے منتظر تھے۔ اساتذہ کی تعداد بچوں کی نسبت زیادہ تھی۔ بچوں کی تعداد بیس پچیس ہوگی۔ مگر اس کے باوجود وہاں ہر سہولت موجود تھی۔ سوئمنگ پول بھی تھا۔

جاپان کے تعلیمی نظام کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ سکول چاہے ٹوکیو یا اوساکا میں ہو یا کسی گاؤں میں، بچے چاہے ہزار ہوں یا دس، کم از کم بنیادی سہولتیں وہی ہوں گی جن میں سوئمنگ پول، گراؤنڈ، ٹینس کورٹ وغیرہ شامل ہیں۔ اور نصاب بھی ایک ہی ہوگا۔ یہ سب سرکاری سکول ہیں۔ کنڈرگارٹن تک تو کچھ پرائیویٹ نرسریاں ہیں مگر پرائمری اور سیکنڈری تعلیم سرکاری سکولوں میں ہوتی ہے اور مفت ہے۔ ہمارے ہاں تو نصاب ہی کئی طرح کے ہیں۔ امیر کا الگ، غریب کا الگ۔ دو مختلف جہان ہیں، ایک حاکموں کا ایک محکوموں کا۔ مساوات کہاں سے ہو؟ غریب تو ٹاٹوں پر بیٹھ کر پڑھے اور امیروں کے لئے ائرکنڈیشنڈ کمرے ہوں۔

حالات ہمیشہ اتنے خراب نہیں تھے۔ میری عمر کے لوگ جو اس وقت ملک کا نظم ونسق چلا رہے ہیں، ان کی اکثریت سرکاری سکولوں سے تعلیم یافتہ ہے۔ اس وقت ان سکولوں کا ایک معیار تھا۔ آج کی طرح سرکاری سکولوں میں تعلیم حاصل کرنا ایک گالی کے مترادف نہیں تھا۔

میرے سکول کے زمانے میں ٹیوشن پڑھنا ایک معیوب فعل سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے والد صاحب کو ہمارا فیل ہونا منظور تھا مگر ٹیوشن رکھنا گوارا نہیں تھا (اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایسی نوبت

کبھی نہیں آئی)۔ اب بچہ سکول کالج سے آتا ہے اور کچھ ہی دیر بعد ٹیوشن کے لئے کمر بستہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہوم ورک اتنا ہوتا ہے کہ رات تک ختم نہیں ہوتا۔ بستہ اتنا بھاری کہ وزن بچے کے برابر۔ یہ کتنا ظلم ہے۔ ہم نے بچوں سے ان کا بچپن چھین لیا ہے۔ جس وقت میں انہوں نے کھیل کود کر جسمانی اور ذہنی طور پر مضبوط ہونا ہوتا ہے اسے ان کے روزمرہ کے معمول سے نکال دیا گیا ہے۔ ہم مجرم ہیں مگر کسی کو احساس نہیں۔

ہوسکتا ہے کہ یہ دلیل دی جائے کہ وہ زمانہ اور تھا۔ اس جدید دور میں مقابلہ بہت سخت ہے اور علم بہت وسیع ہو گیا ہے۔ اس لئے یہ سب ضروری ہے۔ ایسے لوگوں کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ سپین میں بچوں کو ہوم ورک دینے پر پابندی لگا دی گئی ہے اور انگلینڈ میں بھی اس پر سنجیدگی سے غور ہو رہا ہے۔ اہل اقتدار سے استدعا ہے کہ خدارا اپنی آئندہ نسل کو انسان رہنے دو روبوٹ نہ بناؤ۔

•••

معاف کیجئے میں نے جذبات کی روانی میں ایک تقریر کر ڈالی۔

اب واپس ازوشی چلتے ہیں بلکہ ازوشی سے آگے ہی مے جی کا رخ کرتے ہیں۔ یہ چھوٹا سا شہر ہے اور اس کی وجہ شہرت اس کا قلعہ ہے جو ۱۳۳۳ عیسوی میں تعمیر ہوا۔ اسے جاپان کے تمام قلعوں میں سب سے خوب صورت سمجھا جاتا ہے۔ یہ تراسی عمارات کا مجموعہ ہے۔ بڑی عمارت سفید براق رنگ کی وجہ سے بہت خوب صورت اور بارعب ہے۔ اسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دیوقامت پرندہ ہے جو اڑنے کے لئے پر تول رہا ہے۔

باہر سے قدیم نظر آنے والا قلعہ اندر سے خاصہ جدید تھا۔ مختلف قسم کی دوکانیں تھیں جہاں سوونیر بکتے تھے۔ اس کی ہر منزل میں قلعہ کی تاریخ سے وابستہ تصاویر تھیں۔ اس زمانے کے مجسمے، لباس اور ہتھیار بھی نمائش کے لئے موجود تھے۔ اس سفر میں ہنگری کے ڈاکٹر لازلو بھی ہمراہ تھے۔ ایک ہم مزاج کا ساتھ ہونا اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہوتا ہے۔

•••

لازلو کا کمرہ میرے کمرے کے قریب ہی تھا۔ کبھی میں وہاں چلا جاتا کبھی وہ آجاتا۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ وہ آیا تو میں نماز پڑھ رہا ہوتا۔ وہ رک کر انتظار نہ کرتا، واپس چلا جاتا۔

ایک دن وہ آیا تو میں کچھ لکھ رہا تھا۔

دیکھ کر پوچھنے لگا: 'کیا یہ اردو ہے؟'

میں نے کہا: 'نہیں'

کہنے لگا: 'نہ یہ اردو ہے نہ جاپانی تو پھر کیا ہے؟'

میں نے جواب دیا: 'یہ ایک نیا طرزِ تحریر ہے جو میں نے ایجاد کیا ہے۔'

وہ کہنے لگا: 'میں تو تمہیں سیدھا سادھا نمازیں پڑھنے والا مسلمان سمجھتا تھا۔ تم تو بہت تیز اور ہوشیار آدمی ہو۔'

میں نے ہنستے ہوئے کہا: 'کسی کو اس سے کوئی خطرہ نہیں۔ میں صرف ضروری نوٹس اور یادداشتیں لکھنے کے لئے اسے استعمال کرتا ہوں۔'

دراصل سکول کے زمانے ہی سے میں نے اپنا ایک رسم الخط ایجاد کیا ہوا تھا۔ اس کی خوبی یہ تھی کہ اس کے حروف کو انگریزی لکھنے کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا تھا اور اردو لکھنے کے لئے بھی۔

•••

ایک دن لیزلو میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اس نے ایک مشورہ کرنا ہے۔ وہ اپنی بیوی کو بلوانا چاہتا تھا۔

میں نے کہا:

'یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'

کہنے لگا:

'اچھی بات تو ہے مگر اسے کہاں ٹھہراؤں گا۔'

میں نے کہا:

'کیا تم اپنے اردگرد نہیں دیکھتے۔ دسیوں مثالیں مل جائیں گی۔ لوگوں نے اپنی بیویوں یا گرل فرینڈز کو مہینوں سے اپنے کمروں میں رکھا ہوا ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔'

کہنے لگا:

'یہ طریقہ غلط ہے۔ میں ہوسٹل انتظامیہ سے بات کر لوں۔'

میں نے کہا:

'پوچھو گے تو وہ قانون ہی بتائیں گے۔ یعنی تم خود تو بیس ہزار ین میں رہ رہے ہو۔ بیوی کے لئے ساٹھ ہزار ین اور دینے پڑیں گے۔'

کہنے لگا:

'پھر بھی سستا ہے۔ کہیں فلیٹ لوں تو بہت مہنگا پڑے گا۔'

چنانچہ اس نے باقاعدہ اجازت لی۔ بیوی کو بلایا اور اسی ہزار ین ماہوار دے کر اسے قانونی طریقے سے اپنے پاس رکھ لیا۔

اس کی بیوی کا نام مارتھا تھا۔ عمر میں کم از کم دس سال چھوٹی اور انتہائی خوب صورت۔

بے تکلفی تھی اس لئے پوچھ لیا:

'یہ معرکہ کیسے سرانجام دیا؟'

بے نیازی سے کہنے لگا:

'میری شاگرد ہے۔ میں اسے پسند آ گیا اور بات آگے بڑھ گئی۔'

اگر ایسا ہی تھا تو وہ بہت خوش نصیب تھا۔

پہلے خان صاحب پیا گھر سدھار گئے تھے اب لازلو کے گھر والے آ گئے اور مجھے تنہائی محسوس ہونے لگی۔

باقی گوروں کی طرح یہ دونوں بھی جولائی اگست کی چلچلاتی دھوپ میں جب کہ باہر قدم رکھنا بھی مشکل ہوتا تھا، کئی گھنٹے مختصر ترین لباس میں ہوسٹل کی چھت پر لیٹے رہتے۔ مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ ویسے تو یہ گورے گرمی کی بہت شکایت کرتے ہیں مگر اتنی دھوپ کیسے برداشت کر لیتے ہیں۔ مانا ان کے نزدیک tan یعنی سانولا ہونے میں بڑی کشش ہے مگر یہ تو خود کو اذیت دینے والی بات ہے۔ یہ بتا تا چلوں کہ جاپان میں سب سے گرم موسم جولائی اگست کا ہوتا ہے۔ درجہ حرارت تیس بتیس بھی ہو تو تقریباً سو فیصد نمی کی وجہ سے ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ پسینہ خشک نہیں ہوتا اور جسم کو ٹھنڈک نہیں ملتی۔ کیونکہ یہ لوگ وہیں رہتے تھے اس لئے میل جول تو رہا۔ اکثر شاپنگ وغیرہ کے لئے مجھے ساتھ لے جاتے تھے مگر پہلے والی بات نہ رہی۔

•••

۷

۱۹۸۸ عیسوی میں عیدالاضحیٰ ۲۴ جولائی کو تھی۔ اس زمانے میں جاپان میں ایک ہی مسجد تھی۔ اور وہ تھی کوبے مسجد۔ ڈاکٹر تبسم کے ساتھ جا کر نماز پڑھنے کا پروگرام بنا۔

آگے بڑھنے سے پہلے بہتر ہے کہ کوبے (Kobe) کا مختصر تعارف ہو جائے۔

کوبے جاپان کا چھٹا بڑا شہر ہے۔ یہ اوساکا سے ۳۰ کلومیٹر مغرب میں واقع ہے۔ آبادی پندرہ لاکھ ہے۔ اوساکا کی طرح جدید کوبے کی بنیاد ۱۸۸۹ عیسوی میں رکھی گئی۔ اس زمانے میں کوبے بندرگاہ، جاپان کی سب سے مصروف بندرگاہ تھی۔ یہاں کی خاص چیزوں میں ماؤنٹ روکو (Mount Rokko) اور میریکن پارک (Merikan Park) شامل ہیں جن کا ذکر بعد میں آئے گا۔

ہم دونوں علی الصبح کیتا سینری سٹیشن پر ملے اور کوبے روانہ ہو گئے۔ ایک گھنٹہ کا سفر تھا۔

میں کوبے کی مسجد کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ یہ مسجد ترک طرزِ تعمیر کا شاندار نمونہ ہے۔ اسے ۱۹۳۰ عیسوی کے لگ بھگ ترک حکومت کی معاونت سے تعمیر کیا گیا۔ جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں، لیبیا کی حکومت انتظامی اخراجات پورے کرتی تھی، آج کل کی صورتِ حال کا پتہ نہیں۔

مسجد کی اپنی آمدنی کا بھی ایک ذریعہ ہے۔ اس کا کار پارک کافی بڑا ہے جہاں لوگ پیسے دے کر گاڑیاں کھڑی کرتے ہیں۔ اس طرح کافی رقم جمع ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ عطیات بھی ملتے ہیں۔

اس زمانے میں مسجد کے امام عرب تھے مگر عملی طور پر اس کا نظام ایک پاکستانی احسن ضیا

چلا رہے تھے۔ یہ فیصل آباد کے رہنے والے تھے اور واحد شخص تھے جنہیں میں جاپان جانے سے پہلے جانتا تھا۔ وہ اس طرح کہ ان کی بہن میری چھوٹی بہن عذرا حمید کی ایم ایس ای کی کلاس فیلو تھی۔

ضیا صاحب کا تعلق امیر خاندان سے تھا۔ فیصل آباد میں کوکا کولا کی ایجنسی ان کے پاس تھی۔ مگر وہ تبلیغی مقاصد کے لئے جاپان چلے گئے۔ وہاں لمبا عرصہ رہنے کے لئے ایک جاپانی لڑکی کو مسلمان کیا اور شادی کر لی۔ یہ بات ۱۹۷۰ عیسوی کی دہائی کی ہو گی کیونکہ جب میری ملاقات ہوئی تو ان کے بچے دس بارہ سال کے تھے۔

وہ قالینوں کا کاروبار کرتے تھے اوران کا دفتر مسجد کے بالکل قریب تھا۔

اس دن امام صاحب نہیں تھے۔ اس لئے ضیا صاحب کو خطبہ دینا پڑا (جو انگریزی میں تھا) اور نماز بھی پڑھانی پڑی۔ مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ عورتوں کا سیکشن علیحدہ تھا۔ دنیا کے ہر حصے سے آئے ہوئے مسلمانوں سے ملاقات کا موقعہ ملا۔ اتنے لوگوں سے ملنا بہت اچھا لگا اور ہم عصر تک کوبے میں رہے۔

اس کے بعد کوبے جانا معمول بن گیا۔ ایک تو مسجد کی وجہ سے اور دوسرا اشیائے خوردو نوش کی خریداری کے لئے۔ وہاں ہر قسم کی چیز مل جاتی تھی۔ خاص طور پر ایک ہندوستانی ٹیواری صاحب کی دوکان تھی جہاں سے ہر ضرورت پوری ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ مسجد سے حلال گوشت مل جاتا تھا۔

●●●

جاپانی غیر ملکیوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ حکومتی سطح پر بھی اور عوامی سطح پر بھی۔

جاپانی حکومت تو ہمیں سیر سپاٹے کرا ہی رہی تھی۔ ان چھ مہینوں کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ہماری اجنبیت ختم ہو جائے اور ہمارے ذہن میں جاپان کے بارے میں ایک مثبت تاثر اُبھرے۔ جب اصل پڑھائی شروع ہونی تھی تو پھر ان تفریحات کا موقع کہاں ملنا تھا۔

عوامی سطح پر یہ مہمان نوازی اس طرح تھی کہ ہوسٹل کے نوٹس بورڈ پر روز کوئی نہ کوئی اشتہار لگا ہوتا تھا جس میں تفریحی پروگراموں میں شرکت کی دعوت ہوتی تھی۔ ہوسٹل کے طلبا اپنی اپنی سہولت کے مطابق ان پروگراموں میں شرکت کر لیتے تھے۔

●●●

ایک دن میں نے کاوانیشی جے سیز (Kawanishi Jaycees) کی طرف سے ایک پروگرام کا اشتہار دیکھا۔ دوپہر کو جانا تھا، رات کیمپنگ تھی اور اگلے دن واپس آنا تھا۔ کاوانیشی کا علاقہ اوساکا کے شمال مغرب میں ہے اور پہاڑیوں میں گھرا ہوا ہے۔ میں نے بھی اپنا نام لکھ دیا۔

دوپہر کے وقت ایک بس ہمیں لینے آئی۔ میرے ہوسٹل سے تو چار پانچ لوگ ہی تھے مگر بس میں کافی لوگ موجود تھے جن میں جاپانی زیادہ نمایاں تھے۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد ہم ایک ڈیم پر پہنچے۔ وہاں بس رکی اور فوٹو سیشن ہوا۔ میں نے شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی اس لئے توجہ کا مرکز بن گیا۔ ہر کوئی میرے ساتھ تصویر کھنچوانے کی خواہش ظاہر کرنے لگا۔ بھلا مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔

جب ہم کیمپنگ سائٹ پہنچے تو ہمیں چار پانچ گروپوں میں تقسیم کردیا گیا۔ ہر گروپ کے لئے ایک بڑا سا خیمہ تھا۔ ہر گروپ کو کھانے پینے کا سامان دے دیا گیا اور کہا گیا کہ بعد میں ججوں کی ایک ٹیم فیصلہ کرے گی کہ بہترین کھانا کس کا تھا۔

ہر گروپ میں لڑکیاں بھی تھیں۔ ظاہر ہے وہ اس کام میں پیش پیش تھیں۔ اکثر مرد حضرات بھی اس کارروائی میں شامل ہوگئے۔ نیت جو بھی تھی۔ کیونکہ میں اس معاملہ میں بالکل اناڑی تھا اس لئے ذرا دور ہی رہا۔

جب اندھیرا چھا گیا تو کھانا پیش ہوا۔ ججوں نے بھی کھایا اور باقی سب لوگوں نے بھی۔ فیصلہ بھی ہوا اور ایک گروپ کو فاتح قرار دے دیا گیا۔

اس کے بعد بہت ساری لکڑیاں اکٹھی کرکے کیمپ فائر جلائی گئی۔ اس کی روشنی میں مختلف قسم کے کھیل تماشے ہوئے۔ جاپانی ڈرم بجانے والوں کی ایک ٹیم آئی۔ اس کے تمام ممبر قدیم لباس میں ملبوس تھے۔ ان کی مہارت دیدنی تھی۔ کیمپ فائر کی پراسرار روشنی میں یہ سب کچھ افسانوی معلوم ہو رہا تھا۔ وہ بہت دیر تک ڈرم بجاتے رہے اور بہت زور سے بجاتے رہے۔ بعد میں میں نے بھی کوشش کی مگر نہ تو اتنی آواز پیدا کرسکا اور نہ ہی کچھ منٹ سے زیادہ ڈرم بجا سکا۔ یہ سب پریکٹس کے بغیر ناممکن تھا۔ جس کا کام اسی کو ساجھے۔

اس کے بعد خواتین فنکاروں کی ایک ٹیم نے روائتی رقص بون اودوری (Bon Odori) پیش کیا۔ وہ بھی قدیم لباس میں ملبوس تھیں۔ موسیقی سحر انگیز تھی اور رقص کا انداز بھی باکمال تھا۔ لگتا تھا کہ ہم کئی صدیوں پرانے زمانے میں چلے گئے تھے۔ جدید زمانے کی کوئی چیز تھی ہی نہیں۔ نہ بجلی

کی روشنی نہ جدید موسیقی۔ چاروں طرف پہاڑ تھے۔ درمیان میں ہمارے خیمے تھے اور خیموں کے درمیان کیمپ فائر تھی جس کی سحر انگیز روشنی سارے ماحول کو افسانوی رنگ دے رہی تھی۔

یہ پروگرام دو گھنٹے تک چلا۔ اس رات کا رومانس اب بھی میرے ذہن میں ایسے موجود ہے جیسے کل کی بات ہو۔

سونے سے پہلے منتظمین نے اعلان کیا کہ رات یا صبح کے وقت کچھ ہی فاصلے پر واقع دریا کی طرف نہ جائیں وہاں سانپ ہوتے ہیں۔

ایک تو میری پرانی عادت ہے کہ ایسے تفریحی دوروں پر علی الصبح جب سب سو رہے ہوتے ہیں، اٹھتا ہوں اور سیر کے لئے نکل جاتا ہوں۔ مکمل خاموشی اور قدرت سے ہم کلام ہونے کا بہترین موقع ہوتا ہے۔ دوسرا اس دریا کے ذکر نے مجھے متجسس کر دیا۔ سوچا کہ کیا زبردست نظارہ ہوگا۔ پہاڑوں کے بیچ میں بہتا دریا۔ چنانچہ جیسے ہی ذرا سی روشنی ہوئی، میں اٹھ کھڑا ہوا اور دریا کی تلاش میں نکل پڑا۔

بڑا خوب صورت اور پرسکون منظر تھا۔ بڑا مزا آ رہا تھا۔ میں چاروں سمتوں میں چار پانچ سو میٹر گیا مگر کسی دریا کا سراغ نہ ملا۔

جب میں اپنے کیمپ میں واپس آ رہا تھا تو ایک جاپانی ملا۔ میں نے اس سے پوچھا:

'دریا کہاں ہے۔'

کہنے لگا:

'تم اس کے پاس ہی تو کھڑے ہو۔'

میں ہکا بکا رہ گیا اور اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ ایک پکا نالہ تھا جس کے پاس میں کھڑا تھا۔ میں آسانی سے اس کے آر پار کھڑا ہو سکتا تھا۔

تو یہ دریا تھا!

دراصل اس ساری غلط فہمی کی وجہ جاپانی زبان کی اس معاملہ میں تنگ دامنی تھی۔ ہمارے ہاں بہتے پانی کے لئے حجم کے حساب سے دریا، نہر اور کھالا کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ انگریزی میں بھی ایسا ہی ہے۔ مگر جاپانی زبان میں ان سب کے لئے ایک ہی لفظ ہے 'کاوا (kawa)'۔

اور جب یہ بولا جاتا ہے تو سننے والا کوئی بھی مطلب نکال سکتا ہے۔

●●●

ہمیں دوپہر سے پہلے واپسی کا سفر شروع کرنا تھا۔ ناشتہ کے بعد ایک روایتی جاپانی کھیل کا اہتمام ہوا جسے کینڈو (kando) کہتے ہیں۔اس میں ایک تربوز رکھ دیا جاتا ہے اور تقریباً بیس گز کے فاصلے پر کھلاڑی کو کھڑا کرنے کے بعد اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی ہے۔ پھر اسے ایک چکر دیا جاتا ہے جو مکمل ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔یعنی اسے سمت کا کوئی اندازہ نہ رہے۔ اب اسے ایک ڈنڈا پکڑا دیا جاتا ہے۔اس نے اندازے سے تربوز کی طرف جا کر اس پر ڈنڈے سے وار کرنا ہوتا ہے۔اگر تربوز صاف دو حصوں میں تقسیم ہو جائے تو کھلاڑی انعام کا حق دار ہو جاتا ہے۔

کھیل شروع ہوا تو بڑے دلچسپ مناظر دیکھنے میں آئے۔اکثر لوگ تو صحیح سمت کی طرف جا ہی نہ سکے بلکہ چند تو بالکل مخالف سمت میں چل پڑے۔دو چار تربوز کے قریب پہنچے مگر وار نہ کر سکے۔

اتفاق سے میری باری آخر میں آئی۔ میں نے عینک لگائی ہوئی تھی۔اس کے اوپر سے ہی پٹی باندھ دی گئی۔اب اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا کہ مجھے اپنے پاؤں اور ارد گرد کی جگہ نظر آ رہی تھی۔بس اتنی رعایت ہی کافی تھی۔ میں چاہتا تو سیدھا چلتا ہوا تربوز تک پہنچ جاتا مگر اس طرح منتظمین کو شک ہو جاتا۔ میں نے تھوڑی سی اداکاری کی۔کبھی تھوڑا دائیں ہو جاتا تو کبھی تھوڑا بائیں۔آخر میں تربوز کے قریب پہنچ گیا۔ مجھے ہدف صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے نشانہ لے کر وار کیا اور تربوز کو دو ٹکڑے کر دیا۔اس کے ساتھ ہی تالیوں کی گونج بلند ہوئی اور واہ واہ کے نعرے لگنے لگے۔ مجھے ایک کپ اور کچھ رقم انعام میں دی گئی۔

میرے منفرد لباس (شلوار قمیص) اور اس مقابلے کو جیتنے کی وجہ سے میں توجہ کا مرکز بن گیا بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ VIP بن گیا۔

منتظمین میں سے ایک نے مجھے کہا کہ اس کے ساتھ آؤں۔

میں چل پڑا۔ میرے پیچھے پیچھے تمام لوگ چل پڑے۔

کچھ فاصلے پر اینٹوں سے ایک چوکھٹا بنایا گیا تھا۔ یہ تقریباً دس فٹ لمبا اور سات فٹ چوڑا تھا۔اس کو گیلے پلاسٹر آف پیرس سے بھر دیا گیا تھا۔

مجھے کہا گیا کہ یہ سن کلاک ہے،اس پر کچھ لکھ دیجئے، ہمیشہ یادگار رہے گا۔

میں نے 'پاکستان زندہ باد' لکھا۔

اس کے بعد باقی لوگوں کو دعوت دی گئی۔ سب نے کچھ نہ کچھ نقش بنایا۔

میرا اردل ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ جب یہ مرحلہ مکمل ہو گیا تو مجھے کہا گیا کہ چار دیواری کی اینٹوں پر اردو کے ہندسے لکھ دوں۔ میں نے بصد شوق یہ فرمائش بھی پوری کر دی۔

یہ سن کلاک اب بھی وہاں ہوگا۔ جاپان میں قیام کے دوران تو وہاں دوبارہ جانے کی فرصت نہیں ملی۔ شاید مستقبل میں ایسا ممکن ہو۔

●●●

۸

گائی دائی میں چھ مہینے کے کورس کا اختتام قریب تھا۔ پتہ چلا کہ یونیورسٹی کی طرف سے ۲۴ تا ۲۶ راگست ۱۹۸۸ عیسوی تفریحی دورے کا پروگرام ترتیب دیا گیا تھا۔

سب سے پہلے ہمیں بسوں پر کوبے لے جایا گیا۔

ہماری آخری منزل شی کوکو (Shikoku) تھی۔ یہ جاپان کے چار بڑے جزائر میں سب سے چھوٹا ہے۔

راستے میں ہمیں ایک رات اواجی شیما (Awajishima) میں گزارنی تھی۔ یہ ہون شو اور شی کوکو کے درمیان بے شمار چھوٹے چھوٹے جزیروں میں سب سے بڑا ہے۔

اواجی شیما تک لے جانے کے لئے فیری کا سفر تھا۔ موسم بالکل صاف تھا اس لئے ہم عرشے پر کھڑے ہو کر اس سفر سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

آج کل اس سمندری سفر کی ضرورت نہیں۔ کوبے اور اواجی شیما کے درمیان دنیا کا سب سے لمبا (۱۱ کلومیٹر) suspension bridge بن گیا ہے۔ جس قوم نے تیس چالیس سال پہلے سمندر کے نیچے سے ۲۳ کلومیٹر لمبی سرنگ نکال کر اپنے دو بڑے جزیروں ہون شو اور ہوکائیڈو کو ملا دیا ہو، اس کے لئے یہ کارنامہ کوئی بڑی بات نہیں۔

ہم اواجی شیما پر اترے اور وہاں دوپہر کا کھانا کھایا۔

وہاں سے ہم اونارتو (Onaruto) پل کے اوپر سے شی کوکو کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ

تقریباً ایک کلومیٹر لمبا ہے اور بیچ میں کوئی ستون نہیں۔ اس کے دونوں کناروں پر ایستادہ ۳۰۰ فٹ اُونچے ستونوں سے جڑے دیو قامت آہنی رسے اسے سنبھالتے ہیں۔

کوبے اواجی شیما پل میں دو ستونوں کے درمیان یہ لمبائی دو کلومیٹر تک ہے۔ مگر اونارو تو پل کو بنانے میں زیادہ دشواریاں پیش آئیں۔ اس کی وجہ اس کے نیچے سے گزرنے والے سمندر میں پیدا ہونے والے وہ طوفانی بھنور ہیں جن کی شہرت دور دور تک ہے اور ہر وقت انہیں دیکھنے کے لئے آنے والے سیاحوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔

ہم شی کوکو کے دارالخلافہ تاکاماتسو (Takamatsu) پہنچے تو رات ہونے والی تھی۔ رات ہم نے ایک جاپانی ہوٹل میں گزاری۔ لگ رہا تھا کہ تاریخ ایک دو مہینے بعد ہی اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ وہی تاتامی پر بیٹھ کر کھانا، وہی کلچرل شو۔ باہر اسی طرح سمندر اور پہاڑ۔

ہمارا اگلے دن کا پروگرام کان پوراسان (Kanpurasan) مندر جانا تھا۔ سان کا لفظ اس کے بے پناہ تقدس کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ مندر پہاڑ کی چوٹی کے قریب ہے۔ اس تک پہنچنے کے لئے ایک ہزار سیڑھیاں چڑھنا پڑتی ہیں۔ یعنی جاپانیوں کو بھی اپنا دیوتا آسانی سے نہیں ملتا۔

ہم دوستوں میں مقابلہ ہو گیا کہ سب سے پہلے کون مندر تک پہنچتا ہے۔ یہ مقابلہ میں نے جیتا۔ دوسرے نمبر پر شام کے مسلم، اور تیسرے نمبر پر بنگلہ دیش کے فاروق رہے۔ ہم اپنی کامیابی پر اتنے خوش تھے کہ پہاڑ کی چوٹی تک ہو آئے جس کے لئے تین سو سیڑھیاں اور چڑھنی پڑیں۔

ظاہر ہے ہزار سیڑھیاں چڑھ کر مندر تک پہنچنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے پہاڑ کے دامن میں کئی مزدور ڈولیاں لئے کھڑے تھے۔ زائر ڈولی میں بیٹھتا اور دو مزدور ہانپتے کانپتے اسے منزلِ مقصود تک پہنچاتے۔ یہ منظر دیکھ کر لگا کہ وقت الٹی چال چل گیا ڈیڑھ دو سو سال پہلے تک برصغیر میں بھی یہی رواج تھا۔

مندر جتنا مقدس تھا اتنی اس کی شان نہیں تھی۔ بوسیدہ سی کالے رنگ کی لکڑی کی عمارت تھی۔ البتہ اس کے آس پاس کا علاقہ پرسکون تفریح گاہ تھا۔ ہم نے وہاں اچھا وقت گزارا۔ کھانا بھی کھایا اور شام ڈھلے ہوٹل پہنچے۔

•••

اگلے دن کا پروگرام کاواساکی (Kawasaki) سٹیل مل دیکھنے کا تھا جس کا شمار دنیا کی

بڑی سٹیل ملوں میں ہوتا ہے۔

بس میں میرے ساتھ ایک انگریز لڑکی بیٹھ گئی۔ اچھی گفتگو رہی۔

پوچھنے لگی: 'خدا پر یقین رکھتے ہو؟'

میں نے کہا: 'بالکل، یہ تو ہمارے عقیدے کا بنیادی حصہ ہے۔ تم یقین نہیں رکھتیں؟'

کہنے لگی: 'نہیں'

میں نے پوچھا: 'کیا تم قدرت (nature) پر یقین رکھتی ہو؟'

کہنے لگی: 'ہاں'

میں نے کہا: 'بس یہ ہی فرق ہے۔ نظام پر ہم دونوں کو یقین ہے۔ تمہارے خیال میں اتنا مربوط، اتنا پیچیدہ نظام خود بخود چل رہا ہے۔ میرے مطابق ایسا ممکن نہیں۔ یقیناً اسے چلانے والا موجود ہے۔'

وہ لاجواب ہوگئی۔

پھر میں نے پوچھا: 'تم نے فزکس پڑھی ہے؟'

بولی: 'ہاں۔'

میں نے کہا: 'تمہیں پتہ ہے مادہ نہ کم کیا جا سکتا ہے نہ زیادہ۔ یہ بتاؤ کائنات کا مادہ کہاں سے آیا؟'

اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

کہنے لگی: 'تم نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔'

●●●

جب ہم کاواساکی سٹیل مل پہنچے تو ہماری بہت آؤ بھگت کی گئی۔ پرتکلف کھانا کھلایا گیا۔ پھر ایک ہال میں بٹھا کر مل کے بارے میں ایک وڈیو دکھائی گئی۔

ہمارا خیال تھا کہ اگلا مرحلہ مل دکھانے کا ہوگا۔ ایسا ہوا ضرور۔ مگر صرف ایک یا دو منٹ کے لئے۔ ہمیں ایک اونچے سے پلیٹ فارم پر کھڑا کر دیا گیا۔ تقریباً سو فٹ نیچے دہکتے ہوئے سرخ لوہے کو پانی ڈال کر ٹھنڈا کیا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہمارا دورہ مکمل ہو گیا۔

اگر ہم مل کے کچھ حصے دیکھ لیتے تو خدا جانے ہم نے کون سا راز چرا لینا تھا۔ جاپانیوں

کی یہ 'احتیاط' کچھ اور جگہ بھی دیکھی۔

●●●

ستمبر کے شروع میں ہمیں فارغ کر دیا گیا۔ یعنی موج مستی کا زمانہ ختم ہوا۔ ان چھ مہینوں میں ہم حکومت جاپان کے خصوصی مہمان تھے۔ اس کے بعد ہمارا درجہ کم ہو کر صرف مہمان کا رہ جانا تھا۔ یعنی یونیورسٹی کی سنجیدہ اور مشکل زندگی ہماری منتظر تھی۔ ہمارے پاس تقریباً تین ہفتے کا وقت تھا۔ طلبا کی اکثریت کے پیش نظر دوسرے شہروں میں جا کر نئے مرحلے کا آغاز تھا۔ میں اس معاملہ میں خوش قسمت تھا۔ مجھے اسی ہوسٹل میں اسی کمرے میں رہنا تھا۔

میں بہت اُداس ہو گیا تھا۔ سوچا پاکستان کا چکر لگا آؤں۔ گھر والے مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ان چند مہینوں میں میرا وزن پندرہ بیس کلو کم ہو گیا تھا۔

باقی سب خیریت تھی مگر میری دادی جان کی صحت بہت گر چکی تھی۔ انہیں مجھ سے خصوصی پیار تھا۔

جب میں نے واپس جاپان جانے کا قصد کیا تو کہنے لگیں:

'مجھے یہ پتہ ہے کہ میں نے تمہیں اب نہیں دیکھنا۔'

اور ایسا ہی ہوا۔ میری واپسی کے چند مہینے بعد فروری ۱۹۸۹ عیسوی میں ان کے انتقال کی خبر آ گئی۔ اس دن میں نے اپنے پروفیسر سے چھٹی مانگی کہ میں غم کی وجہ سے کام نہیں کر سکتا اور اپنے کمرے میں جانا چاہتا ہوں۔

پوچھنے لگے: 'ان کی عمر کتنی تھی؟'

میں نے کہا: '۹۱ سال'۔

کہنے لگے: 'پھر تو وہ اپنی عمر گزار گئیں'۔

مطلب یہ تھا کہ مجھے اتنا غم نہیں ہونا چاہئے تھا۔

میں نے کہا:

'مگر میری ان کے ساتھ پینتیس سالہ رفاقت تھی۔ وہ کیسے بھولوں؟'

وہ میری بات سن کر خاموش ہو گئے اور سر جھکا لیا۔

●●●

باب دوم
(اکتوبر ۱۹۸۸ تا اکتوبر ۱۹۸۹ عیسوی)

۱

چھٹیاں پلک جھپکتے میں گزر گئیں۔ بوجھل دل کے ساتھ میں پھر آمادہ سفر ہوا۔ اہلِ خانہ بھی مضطرب تھے۔ مگر یہ ایک ایسا مرحلہ تھا جس سے گزرنا ہی تھا۔

میری پہلی منزل ٹوکیو تھی۔ وہاں میرا گائی دائی کے زمانے کا ایک دوست، پیٹرک اوکواچ رہتا تھا۔ وہ کینیا کا رہنے والا تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ اس کے پاس ایک دن گزار کر اوساکا کا رُخ کروں۔ یہ ایک دن ٹوکیو جیسے دو کروڑ کی آبادی والے عظیم شہر کو دیکھنے کے لئے بالکل ناکافی تھا۔ بلکہ ایک مہینہ بھی شاید کافی نہ ہو۔ اس لئے ایک دو جگہوں کا ہی انتخاب کیا جا سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں بتاؤں کہ کن جگہوں کا انتخاب ہوا، ٹوکیو کے چند مشہور ترین مقامات کا ذکر کر دوں۔

آج کل تو ٹوکیو کی سب سے نمایاں پہچان ٹوکیو سکائی ٹری (Tokyo skytree) ہے مگر اس زمانے میں اس کا وجود نہیں تھا البتہ ٹوکیو ٹاور موجود تھا۔ ٹوکیو سکائی ٹری ۲۰۸۰ فٹ اونچا ہے اور دبئی کے برج خلیفہ کے بعد دنیا کی سب سے بلند تعمیر ہے۔

پچھلی صدی میں ٹوکیو کو دو بڑے حادثات سے دوچار ہونا پڑا جس کی وجہ سے تقریباً تمام تاریخی عمارات منہدم ہو گئیں۔ پہلا حادثہ ۱۹۲۳ عیسوی کا زلزلہ تھا جس میں لاکھوں لوگ مارے گئے اور دوسرا، دوسری جنگِ عظیم۔ اگرچہ ٹوکیو ایٹمی حملے سے تو بچ گیا مگر اس پر اتنی بمباری کی گئی کہ ایک موقعہ پر ایک رات میں بیس ہزار سے زیادہ لوگ مر گئے۔

ان آفات کے باوجود شاہی محل بچ گیا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں ۱۴۵۷ عیسوی میں ایڈو

(Edo) یا ٹوکیو کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کی پرشکوہ عمارات کے اردگرد سترہویں صدی کی بنائی دیواریں، باغات اور پانی سے بھری خندقیں ہیں۔ محل کی دیواریں سوا چھ فٹ موٹی ہیں۔ اس محل کے صرف ایک باغ تک عام پبلک کی رسائی ہے۔ محل کے بڑے باغات سال میں صرف دو دفعہ، ۲ جنوری اور ۲۹ اپریل کو کھولے جاتے ہیں تاکہ لوگ شہنشاہ کا دیدار کر سکیں۔

ٹوکیو کی سب سے مشہور جگہ گنزا (Ginza) ہے جو ٹوکیو کے ابتدائی دنوں سے ہی کاروباری مرکز ہے۔ یہاں سے پانچ سڑکیں نکلتی ہیں جو جاپان کے دیگر بڑے شہروں سے جا ملتی ہیں۔ یہاں ہر وقت گہما گہمی رہتی ہے۔ ہفتے اور اتوار کو ۱۲ بجے دوپہر سے ۵ بجے شام تک گاڑیوں کا داخلہ منع ہے تاکہ پیدل چلنے والوں کو آسانی ہو۔

شور شرابہ پسند کرنے والے لوگوں کے لئے یہ بہترین جگہ ہے۔ ہر قسم کی دوکانیں موجود ہیں اور تل دھرنے کی جگہ نہیں ملتی۔ رات کو بڑے بڑے بل بورڈ عجب ماحول بنا دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ جاپان کا سب سے بڑا کابوکی (Kabuki) تھیٹر بھی یہیں ہے۔

قدرتی ماحول کو ترجیح دینے والوں کے لئے شہر کے مرکز میں موجود اواینو (Ueno) پارک ہے۔ اس کا رقبہ ۱۲۱۲ ایکڑ ہے اور بڑے بڑے سرسبز میدانوں کے علاوہ یہاں جاپان کا سب سے پرانا چڑیا گھر، کشتی رانی کے لئے ایک جھیل، ماہی خانہ (aquarium) اور کئی عجائب گھر اور مندر ہیں۔

ٹوکیو نیشنل میوزیم میں ایک لاکھ سے زیادہ شاہکار ہیں جن میں سے کم و بیش سو کو قومی خزانہ کا درجہ حاصل ہے۔ اس میں چھٹی صدی عیسوی سے شروع ہو کر ماضی قریب تک کے چینی اور جاپانی شاہ پارے رکھے گئے ہیں۔

جاپانی تاریخ کے غالباً سب سے مشہور شہنشاہ مے جی (Meiji) کی یاد میں ۱۹۱۵ عیسوی میں ایک عمارت کی تعمیر کا آغاز ہوا جو ۱۹۲۰ عیسوی میں مکمل ہوئی۔ دوسری جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں کے بعد ۱۹۵۵ عیسوی میں اسے دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ اس کے اردگرد ۱۷۵ ایکڑ پر پھیلے جنگلات ہیں۔

•••

اب ہم نے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ مندرجہ بالا مقامات میں سے کس کا انتخاب کیا جائے۔ اوکواچ کے ایک جاپانی ہمسائے نے ہمارے ساتھ جانے کی حامی بھر لی تھی۔ آخر یہ طے ہوا کہ دن

کے وقت اوائینو (Ueno) پارک جا کر شام کو گنزا کا چکر لگایا جائے۔

اوکواچ ٹوکیو یونیورسٹی کے نواح میں رہتا تھا اور وہاں سے اوائینو پارک زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم صبح نو بجے وہاں پہنچ گئے۔ پارک میں داخل ہوئے تو اس کی وسعت نے حیران کر دیا۔

اس پارک میں ۸۸۰۰ درخت ہیں جن میں سے ۸۰۰ درخت چیری کے ہیں جنہیں جاپانی ساکورا (sakura) کہتے ہیں۔ جب ان درختوں پر پھول آتے ہیں تو بہت دلکش منظر ہوتا ہے۔ جاپانی اسے تقدس کی حد تک چاہتے ہیں۔ وہاں کچھ بے گھر لوگ بھی نظر آئے۔ یہ بات میرے لئے بہت عجیب تھی۔ اوساکا میں تو کبھی ایسا منظر نہیں دیکھا تھا۔ پتہ چلا کہ پولیس انہیں کئی بار گرفتار کرتی ہے مگر رہا ہوتے ہی پھر یہاں پہنچ جاتے ہیں۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے تک بے مقصد گھومنے کے بعد ہم نے چڑیا گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ وجہ یہ تھی کہ کئی میوزیم ہونے کی وجہ سے ہم کسی ایک پر متفق نہیں ہو سکے تھے۔ یہ چڑیا گھر جاپان میں سب سے پرانا ہے اور اس میں چار سو قسم کے تین ہزار سے زیادہ جانور ہیں۔ مگر اس کی وجہ شہرت بڑا پانڈہ (Giant Panda) ہے جو ۱۹۷۲ عیسوی میں چین کی طرف سے تحفہ میں دیا گیا اور جاپان میں یہ پہلا پانڈہ تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم نے گنزا (Ginza) کا رخ کیا۔ اتوار کا دن تھا اس لئے ۵ بجے تک گاڑیوں کا داخلہ بند تھا۔ ہماری کوشش تھی کہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔ جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں، یہ ٹوکیو کا تجارتی مرکز ہے اور بڑے بڑے ڈپارٹمنٹل سٹور اور شوروم ہیں۔ ان میں زیادہ مشہور واکو (Wako) بلڈنگ اور ہاتوری ٹاور (Hattori tower) ہیں۔ یہ ٹاور سیکو (Seiko) کے بانی کے نام پر ہے۔ یہاں گھومتے پھرتے ہمیں اپنی تنگ دستی اور کم مائیگی کا بہت احساس ہوا۔ اپنی مالی حیثیت کے حساب سے تو ہم شاید ونڈو شاپنگ کے بھی اہل نہیں تھے۔ بہر حال ونڈو شاپنگ کی اور کافی دیر تک کی۔

دل تو چاہتا تھا کہ رات کے مناظر بھی دیکھوں مگر وقت نہ میرے پاس تھا نہ میز بانوں کے پاس۔ اس لئے 'پھر کبھی سہی' کی امید دل میں جگائے میں وہاں سے رخصت ہوا۔

اسی رات کو ایک گھنٹے کے ہوائی سفر کے بعد میں اوساکا پہنچ گیا۔

●●●

۲

اب ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ زیادہ سنجیدہ اور محنت طلب۔

میرا ہوسٹل بھی وہی تھا اور کمرہ بھی۔ اگر چہ ہوسٹل میں باورچی خانہ تھا مگر کم ہی لوگ اسے استعمال کرتے تھے۔ زیادہ تر لوگ اپنے کمروں میں ہی کھانا پکاتے تھے۔ کمروں میں ہی ہیٹر، کوکر، فرج وغیرہ رکھے ہوئے ہوتے تھے۔ جو لوگ ایک سے زیادہ تھے انہوں نے برآمدوں پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ چونکہ کوئی انتظامیہ سے پوچھتا نہیں تھا اس لئے کسی کو منع بھی نہیں کیا جاتا تھا۔

پہلے چھ مہینے تو میں نے کینٹین میں کھانا کھا کر گزار دیے تھے مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ کئی کلو وزن کم کرنے کے بعد گھر پہنچا تو سب لوگ تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ اب میں نے فیصلہ کیا کہ خود کھانا پکانا شروع کروں۔ مگر ایک بنیادی مسئلہ تھا۔ میں نے زندگی میں کبھی انڈہ بھی نہیں ابالا تھا۔ اس ناتجربہ کاری کے پیش نظر میں نے والدہ اور اہلیہ سے پوچھ کر کچھ 'فارمولے' لکھ لئے تھے۔

ہوسٹل میں ایک بہت اچھا رواج تھا کہ جانے والے اپنی چیزیں یا تو تحفہ کے طور پر ساتھیوں کو دے جاتے تھے یا برائے نام قیمت وصول کر لیتے تھے۔ اس طرح ایک فرج، ہیٹر اور ککر کا بندوبست ہو گیا۔ کراکری بھی اسی طرح مل گئی اور میں نے طبع آزمائی شروع کر دی۔ اسی اچھی عادت کہیں یا بری میں شروع ہی سے کھانے کے بارے میں اتنا حساس نہیں ہوں۔ جو بھی مل جائے اور جیسا بھی مل جائے۔

اس عادت کی وجہ سے مجھے اپنا پکایا کھانے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ گوشت کو بے کی

مسجد سے آجاتا تھا اور دالیں وغیرہ ٹواری کی دوکان سے۔ سبزیاں عام مارکیٹ سے مل جاتی تھیں۔ البتہ پکی ہوئی روٹی کا بندوبست ناممکن تھا۔ اس لئے اپنے جاپان کے قیام کے دوران ڈبل روٹی پر ہی گزارا کیا۔ اسے ہی سالن کے ساتھ استعمال کرتا رہا۔ میں یہ دعوٰی نہیں کرتا کہ میرا پکایا کوئی اور بھی کھا سکتا تھا مگر میرا گزارا ہو گیا۔

●●●

ہوسٹل کے پرانے ساتھی تو جا چکے تھے۔ نئے آنے والوں میں دو ہی قابل ذکر نام تھے جن سے تبادلہ خیال ہو جاتا تھا۔ ایک بنگلہ دیش کا دین محمد خسرو اور دوسرا اردن میں مقیم فلسطینی علی الحاج۔ وہاں ملنے والے بنگلہ دیشی دو قسم کے تھے۔ کچھ بہت ملنسار اور محبت کرنے والے اور کچھ کھلم کھلا نفرت کا اظہار کرنے والے۔ ظاہر ہے کہ خسرو کا تعلق پہلی قسم سے تھا۔ وہ انجینئر تھا اور پانچ سال علیگڑھ میں پڑھتا رہا تھا۔ اس وجہ سے اس کی اردو بہت اچھی تھی۔ عمر میں چھ سات چھوٹا تھا۔ اس کے ساتھ سیر سپاٹا بھی رہتا تھا۔ اچھی رفاقت تھی۔

اس کی رخصت کا وقت آیا تو اس نے کچھ چھٹیاں لے لیں۔ میں نے سوچا کہ گھر جا کر مل آؤں۔ میں وہاں پہنچا تو خسرو اور اس کی بیوی سخت الجھن میں تھے۔ سامان زیادہ تھا اور اس کی بیوی ہر چیز ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ یہ ایک قدرتی وجہ تھی کہ وہ مجھے زیادہ توجہ نہ دے سکا۔ مگر اس کی بیوی کا نفرت آمیز رویہ چھلکا جا رہا تھا۔ میں نے مناسب یہی سمجھا کہ واپس چلا آؤں۔

علی الحاج محبت کرنے والا زیرک اور سمجھدار انسان تھا۔ جاپان میں جتنے بھی عرب ملے وہ پاکستان سے محبت کرتے تھے۔ خاص طور پر شامی اور اردنی عرب۔ وہ ان کی جنگوں میں پاکستانیوں کی عملی شمولیت کو نہیں بھولے تھے۔ متعصب اور امیر عرب ملکوں کے طالب علم امریکہ اور یورپ کو اپنا قبلہ سمجھتے تھے اور جاپان ان کے معیار کے مطابق نہ تھا۔ اس لئے ان سے پالا نہیں پڑا۔

علی الحاج بہت اچھا دوست تھا مگر اس کی مصروفیات بہت زیادہ تھیں۔ اس لئے ملاقات کم ہی ہوتی تھی۔ تمام عربوں کی طرح وہ نماز کبھی نہیں چھوڑتا تھا مگر اس کے علاوہ:

جو مل گیا اسی کو مقدر سمجھ لیا

●●●

یونیورسٹی کا ماحول بھی گائی دائی سے بالکل مختلف تھا۔ وہاں ہر وقت جشن کا سماں رہتا

تھا، یہاں سنجیدگی درودیوار سے ٹپکتی نہیں بہتی تھی۔ ہر شخص اس طرح سوچ میں گم نظر آتا تھا جیسے افلاطون اور سقراط گھوم رہے ہوں۔

یہ سنجیدگی اتنی نمایاں تھی کہ یونیورسٹی کی بیشتر خوبیاں دب جاتی تھیں۔ مثلاً کیمپس کے اندر ہی ایک بہت خوب صورت جھیل تھی جس میں پرندے چہلیں کرتے نظر آتے تھے۔ سبزہ بھی بہت زیادہ تھا۔ دس دس منزلہ عمارات کے گھیرے کے بیچوں بیچ کینٹین، co-op اور چھوٹے چھوٹے پارک تھے۔ co-op کے سامنے وینڈنگ مشینوں کی قطار تھی جہاں سے آپ چوبیس گھنٹے ہر قسم کی نوڈل اور دوسری کھانے پینے کی اشیا لے سکتے تھے۔

کینٹین بہت بڑی تھی۔ داخل ہوتے ہی ایک الماری تھی جس میں اس دن کے مینو کی پلیٹیں لگی ہوتی تھیں اور قیمت درج ہوتی تھی جو تین یا چار سو ین ہوتی تھی۔ ہم ایک اور مشین میں رقم ڈال کر اپنی پسند کا بٹن دباتے اور ایک پرچی اور بقایا رقم مل جاتی۔ یہ پرچی لے کر لائن میں لگ جاتے اور اپنی باری آنے پر کھانا لے لیتے۔

میرے انسٹیٹیوٹ سے اس جگہ پہنچنے میں تین چار منٹ ہی لگتے تھے۔

•••

جاپانیوں کی کام کرنے کی عادت تو دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اسی وجہ سے انہیں workohlic کہا جاتا ہے۔ میرے جاپان پہنچنے سے کچھ ہی عرصہ پہلے وہاں ہفتہ وار دو چھٹیوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نوجوانوں کو چھوڑ کر باقی ملازموں نے باقاعدہ احتجاج کیا کہ یہ فیصلہ واپس لیا جائے۔ وہ ہفتہ کا فارغ دن کیسے گزاریں گے۔

اب شاید کچھ فرق پڑ گیا ہو مگر اس زمانے میں دفتری دستور یہ تھا کہ باس رات کے دس بجے تک بیٹھا رہتا تھا اور ظاہر ہے کہ ماتحتوں کو بھی بیٹھنا پڑتا تھا۔ پھر سب لوگ اکٹھے ہو کر کسی شراب خانے میں چلے جاتے تھے اور جی بھر کر بیئر (beer) پیتے تھے۔ اس طرح وہ صبح چھ سات بجے کے نکلے رات گیارہ بجے تھکے ہارے گھر پہنچتے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی خانگی اور ازدواجی زندگی کیسی ہو گی۔

میں اپنی تنہائی سے فرار حاصل کرنے کے لئے رات کو اکثر ہوسٹل کے قریب واقع منامی سینری (Minami Senri) پارک میں جا بیٹھتا تھا اور ان نشے میں دھت گھر لوٹنے والے لوگوں کو

دیکھ کر محظوظ ہوتا تھا۔ کوئی بھی شخص ایسا نہ تھا جس کے پاؤں سیدھے پڑتے ہوں۔ یہی نہیں، گلوکاری کے نادر انداز بھی دیکھنے کو ملتے تھے۔ عمر کی کوئی قید نہیں تھی۔ تیس سال سے ستر سال تک کے مرد اس میں شامل تھے۔ جی ہاں میں نے مرد کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا۔ خواتین بھی شراب خانوں سے اٹھ کر آتی تھیں مگر انہیں اپنے پینے پر قابو ہوتا تھا۔ اس لئے اس قسم کی حرکتیں نظر نہیں آتی تھیں۔

دن کے وقت بھی یہ پارک ایک بیش قیمت گوشہ عافیت تھا۔ اس میں ایک بڑی جھیل تھی جس کے کنارے لوگ کانٹے ڈالے سارا دن مچھلیوں کا انتظار کرتے تھے۔ زیادہ تر ریٹائرڈ زندگی گزارنے والے ہوتے تھے۔ نسبتاً کم عمر لوگوں کے لئے کشتی رانی کی سہولت تھی۔

رات کے اس پہر پارک کے کونے کھدروں میں درختوں کی اوٹ میں نوجوان جوڑے گفتنی و ناگفتنی حرکات میں مصروف نظر آتے تھے۔ اگرچہ جاپان میں جنسی بے راہ روی بہت عام ہے مگر پوشیدہ۔ سڑک پر چلتے ہوئے یا بازار میں آپ کو کوئی بھی شخص غیر مناسب یا مختصر لباس میں نظر نہیں آئے گا۔ یہ مغرب کے مقابلہ میں ایک واضح فرق ہے۔

یہی نہیں، ہر جاپانی کی خاص طور پر خواتین کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ بہترین اور باوقار لباس پہنیں۔ اس لحاظ سے ان کا مزاج امریکنوں کی بجائے انگریزوں سے زیادہ ملتا ہے۔ روایتی انگریز بھی آپ کو ہر حال میں ٹائی سوٹ میں ملے گا۔

جاپان اور برطانیہ میں اور بھی کئی چیزیں مشترک ہیں، مثلاً بادشاہت، دنیا کی واحد دو فلاحی ریاستیں ہونا، جغرافیائی طور پر جزیرے ہونا اور موسموں کی ترتیب۔

●●●

ایک تو یونیورسٹی کا خشک ماحول، دوسرا ہوسٹل میں بھی تنہائی۔ وقت مشکل سے گزرنے لگا۔ میرے پروفیسر صاحب بھی ابھی میرا جائزہ لے رہے تھے۔ اس لئے کرنے کا کوئی خاص کام نہیں تھا۔ یہ بڑا کٹھن وقت تھا۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں مضبوط اعصاب کا مالک ہوں مگر ان حالات میں مجھے بھی دو چیزوں کا سہارا لینا پڑا۔ سگریٹ نوشی اور ٹی وی پر سوموریسلنگ۔ یونیورسٹی بدل گئی تھی اس لئے ڈاکٹر تبسم سے بھی ملاقات کچھ کم ہی ہوتی تھی۔

انہی دنوں میں مجھے لفظ تنہائی کا عرفان حاصل ہوا۔ کچھ لمحے اتنے تکلیف دہ بن جاتے کہ الفاظ اس کیفیت کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ ان لمحوں کا دورانیہ چند منٹ سے کئی گھنٹوں پر محیط ہوتا۔

یہ لمحے میرے پورے قیام کے دوران سر اٹھاتے رہے۔ کبھی کم وقفے سے کبھی زیادہ سے۔

میں زندگی میں بہت مشکل مراحل سے بھی گزرا ہوں مگر وطن میں رہتے ہوئے کبھی ان لمحات سے واسطہ نہیں پڑا اور اللہ سے دعا گو ہوں کہ اب کبھی نہ پڑے۔

مجھے یقین ہے کہ یہ مجھ اکیلے کا ہی تجربہ نہیں۔

•••

سگریٹ پینے شروع کیے تو میں چین سموکر بن گیا۔ اتنی احتیاط ضرور کرتا تھا کہ بہت ہلکی مقدار میں نکوٹین اور ٹار والا برانڈ پیوں۔ نکوٹین نشہ کرتی ہے اور ٹار بیماریوں کا باعث ہے۔

میں اعشاریہ ایک ملی گرام ٹار والا برانڈ پیتا تھا۔ جبکہ میرے ایک پروفیسر سوگی موتو ۲۵ ملی گرام ٹار والا سگریٹ ہر وقت لب سے لگائے رکھتے تھے۔ وہ احتیاط یہ کرتے تھے کہ ایک تہائی سگریٹ پی کر باقی ایش ٹرے کی نذر کر دیتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے اس زمانے کے سگریٹ کہیں زیادہ تیز ہوں گے مگر یہاں تو آپ کو پتہ ہی نہیں چل سکتا تھا۔

جاپان میں سگریٹ کی ڈبیا پر ہر جز کی مقدار لکھنے کی پابندی تھی اور اس کی باقاعدہ چیکنگ ہوتی تھی۔ ایک دفعہ یہ ہوا کہ اعشاریہ ایک ملی گرام ٹار کا دعوٰی کرنے والے سگریٹ میں سے ٹار کی مقدار ایک اعشاریہ ایک چار ملی گرام نکل آئی۔ کمپنی کو پورے جاپان میں اپنا مال مارکیٹ سے اٹھانا پڑا۔

میں یہ بری عادت پاکستان اپنے ساتھ لے کر آیا اور چھ سات سال اس میں گرفتار رہا۔ یہ ضرور تھا کہ چونکہ پاکستان میں اتنے ہلکے سگریٹ دستیاب نہیں تھے، اس لئے میں گولڈ لیف یا ڈن ہل کے دن میں چار پانچ سگریٹ ہی پیتا تھا۔

میری والدہ دبے لفظوں میں مجھے منع کرتی تھیں مگر میں طرح دے جاتا تھا۔

ایک دن انہوں نے مجھے پاس بٹھالیا اور کہنے لگیں:

'سگریٹ پینے چھوڑ دو'

میں نے کہا:

'اچھا جی'

کہنے لگیں:

'نہیں مجھ سے وعدہ کرو'۔

ان کا حکم کیسے ٹال سکتا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن میں نے سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا۔

میرا چھوٹا بھائی ڈاکٹر طارق حمید بھی تمباکو نوشی کرتا تھا۔ اسے بھی حوصلہ ہوا اور اس نے بھی یہ بری عادت ترک کر دی۔

•••

جہاں تک سوموریسلنگ کا سوال ہے، اس کی ندرت مجھے اپنی طرف کھینچتی تھی۔ جاپانیوں نے اپنی قدیم روایات، جن میں نوہ (Noh) اور کابوکی (Kabuki) بھی شامل ہیں، کو پوری شد و مد سے زندہ رکھا ہوا ہے۔ یہ ان کی زندگی کا مستقل حصہ ہیں اور اسی طرح مقبول ہیں جیسے جدید کھیل، فلم اور ڈرامہ۔ ہر شہر میں لاتعداد تہوار ہوتے ہیں جن میں زمانہ قدیم کے لباس پہن کر ماضی کا سفر کیا جاتا ہے اور اس دن یا اس وقت کے لئے اس قدیم دور میں جیا جاتا ہے۔

ٹی وی پر سوموریسلنگ دیکھتے ہوئے اگر چاروں طرف بیٹھے تماشائی نظر انداز کر دیں تو یہی لگتا ہے کہ آپ ماضی میں جھانک رہے ہیں اور وقت الٹی چال چل گیا ہے۔

سومو کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ پہلوان جنہیں ری کی شی (rikishi) کہا جاتا ہے، ایک گول رنگ (دوہی یو، dohiyo) میں آمنے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ گھنٹی بجتے ہی یا تو وہ مخالف کو دھکیلتے ہوئے رنگ سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں یا پاؤں کے علاوہ جسم کے کسی بھی حصے کو زمین سے لگانے کی سعی کرتے ہیں۔ جیسے ہی دونوں میں سے ایک چیز ہو جاتی ہے، مقابلہ ختم ہو جاتا ہے۔ عموماً اس مقابلے میں چند سیکنڈ ہی لگتے ہیں مگر بعض دفعہ بات کئی منٹ تک چلی جاتی ہے۔ ایسا مقابلہ بے حد سنسنی خیز ہوتا ہے۔

ہر میچ سے پہلے قدیم لباس میں ملبوس ریفری کچھ قدیم روایات کے مطابق اسے شروع کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ یہ ریفری بالکل دُبلے پتلے ہوتے ہیں مگر بہت پھرتیلے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ اپنے سے چھ سات گنا وزنی پہلوانوں کے ٹکراؤ میں ملیامیٹ ہو جائیں۔

عموماً سومو پہلوان بہت موٹے ہوتے ہیں اور ان کا وزن جان بوجھ کر بڑھایا جاتا ہے تا کہ وہ اپنے وزن کے زور پر مخالف کو دھکیلتے ہوئے رنگ سے باہر کر دیں۔ وہ ناشتہ نہیں کرتے مگر دوپہر کے وقت چاولوں سے بنا ایک خاص ملغوبہ کھاتے ہیں (جس میں مچھلی، گوشت اور سبزیاں

ہوتی ہیں) اور بے حساب کھاتے ہیں۔اس کے بعد کئی لٹر بیئر پی کر سو جاتے ہیں۔

اس معمول کا ان کی صحت پر برا اثر پڑتا ہے اور ان کی عمر پچاس ساٹھ سال سے زیادہ نہیں ہوتی جبکہ عام جاپانی ۸۰ سال سے زیادہ جیتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ لوگ اس پیشہ کی طرف کیوں آتے ہیں؟

جواب یہ ہے کہ ان کی زندگی شاہانہ ہوتی ہے۔سال میں چھ قومی سطح کے ٹورنامنٹ ہوتے ہیں اور بہت کمائی ہوتی ہے۔اس کے علاوہ ان کی مقبولیت کسی بھی کھلاڑی یا فلم سٹار سے کم نہیں ہوتی۔لڑکیاں اسی طرح لائنوں میں ان کے آٹوگراف کے لئے کھڑی ہوتی ہیں اور شادی کی متمنی بھی۔اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا بھی انہیں بہت اہمیت دیتا ہے۔

موٹاپا اچھا سومو پہلوان بننے کے لئے ضروری نہیں۔میرا پسندیدہ پہلوان چیون فیو جی (Chiyunfuji) تھا جو سومو کی تاریخ کے عظیم ترین پہلوانوں میں شمار ہوتا ہے۔اس کا جسم عام آدمیوں جیسا تھا مگر اس کی پھرتی اور داؤ پیچ کی مہارت کسی کو اس کے سامنے ٹکنے نہیں دیتی تھی۔

سب سے اوپر والے درجے کے پہلوانوں کو یوکوزونا (yokozuna) کہتے ہیں۔یہ ایک وقت میں ایک دو ہی ہوتے ہیں۔

•••

روائتی کشتی سومو کے علاوہ جاپانیوں نے جدید فری سٹائل کشتی میں بھی بڑا نام کمایا ہے۔

جاپان میں جدید پروفیشنل ریسلنگ کا آغاز ۱۹۵۳ عیسوی میں ہوا۔اس کی بنیاد ایک سومو پہلوان رکی دوزان (Rikidozan) نے رکھی۔اس نے ۱۹۵۷ عیسوی میں ایک نامور امریکی پہلوان لیو تھیز کو شکست دے کر جاپان میں اس کھیل کی مقبولیت کے دروازے کھول دیے۔مگر اس کھیل کو بام عروج تک پہنچانے والے دو نام تھے۔ایک جائنٹ بابا (Giant Baba) اور دوسرا مشہور زمانہ انتونیو انوکی (Antonio Inoki) جس نے ۱۹۹۰ عیسوی میں اسلام قبول کرنے کے بعد اپنا نام محمد حسین انوکی رکھ لیا(مگر اس نے اس کا اقرار ۲۰۱۲ عیسوی میں کیا)۔آج کل وہ جس ریسلنگ کمپنی کا مالک ہے وہ اس کھیل میں دنیا کی دوسری بڑی کمپنی ہے جو ہر سال ٹوکیو میں ۴ جنوری کو ایک بہت بڑا بین الاقوامی ٹورنامنٹ کرواتی ہے جس میں ساری دنیا سے پہلوان شرکت کرتے

ہیں۔اس کے علاوہ اور بھی کمپنیاں ہیں جو سال بھر مختلف شہروں میں مقابلے کرواتی ہیں۔

انوکی کا پاکستان سے خاص تعلق رہا ہے۔اس کی مشہور پاکستانی پہلوان اکرم عرف اکی سے کشتی ہوئی تھی جس میں انوکی جیت گیا۔مگر کئی سال بعد وہ زبیر عرف جھارا سے ہار گیا۔

اس کی اصل وجہ شہرت عظیم باکسر محمد علی کلے سے ۱۹۷۶عیسوی میں ٹوکیو میں مقابلہ تھا جس میں محمد علی باکسنگ کرتا رہا اور انوکی مارشل آرٹس استعمال کرتا رہا۔ یہ مقابلہ برابر رہا۔اس سے mixed martial arts کی بنیاد پڑی۔

●●●

مارشل آرٹس کی بات ہو اور جوڈو کراٹے کا ذکر نہ آئے، یہ ممکن نہیں۔ان دونوں کھیلوں کا تعلق بھی جاپان ہی سے ہے۔

ان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جوڈو میں گرفت اور مخالف کو اٹھا کر پھینکنے کی اہمیت ہے جب کہ کراٹے میں ہاتھ اور پاؤں سے ضرب لگا کر مخالف پر غلبہ حاصل کیا جاتا ہے۔

جوڈو کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں۔اسے ۱۸۸۲عیسوی میں جی گوروکانو (Jigoro Kano) نامی ایک جاپانی نے متعارف کرایا۔ جوڈو کے کھلاڑی کو جوڈوکا(judoka) کہا جاتا ہے جو سفید رنگ کا کرتا پاجامہ پہنتا ہے۔کرتے کو اواگی (uwagi)اور پاجامے کو زوبون (zubon) کہتے ہیں۔اس کے علاوہ ایک پیٹی ہوتی ہے جسے اوبی(obi) کہا جاتا ہے۔اس کا رنگ کھلاڑی کے درجے کو ظاہر کرتا ہے۔ نئے سیکھنے والے کی پیٹی سفید رنگ کی ہوتی ہے۔ یہ رنگ ترقی کے مراحل کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ جب یہ سمجھا جاتا ہے کہ کھلاڑی نے کافی مہارت حاصل کر لی ہے تو اسے بلیک بیلٹ(black belt) دی جاتی ہے۔

ہمارے ہاں یہ غلط فہمی ہے کہ بلیک بیلٹ سب سے بڑا اعزاز ہے۔ بلیک بیلٹ لینے کے بعد کھلاڑی آٹھ مزید مراحل مقابلوں کے بعد طے کرتا ہے۔نواں درجہ جسے کودان (kudan) کہتے ہیں، ایک کمیٹی کی سفارش پر دیا جاتا ہے۔سب سے بڑے درجہ کو جودان(judan) کہا جاتا ہے۔اس کے مستحق کا فیصلہ بھی کمیٹی ہی کرتی ہے۔اب تک ۱۵ جاپانی مرد اور ایک عورت اس انتہائی درجہ تک پہنچے ہیں۔اس کے علاوہ دنیا کے مختلف ممالک میں گیارہ اور مرد بھی یہ مقام حاصل کر چکے ہیں۔

کراٹے کی تاریخ ذرا پرانی ہے اور یہ چینی مارشل آرٹس سے متاثر ہے۔ اس کھیل کا آغاز ریوکو بادشاہت (Riyukyu kingdom) سے ہوا جس میں اوکی ناوا اور چند اور جزائر شامل ہیں۔ جب ۱۸۷۹ عیسوی میں جاپان نے ریوکو بادشاہت پر قبضہ کیا تو یہ کھیل جاپان پہنچا۔ کہا جاتا ہے کہ پوری دنیا میں کراٹے کے کھلاڑیوں کی تعداد دس کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے۔

•••

۳

ڈپارٹمنٹ میں میری حیثیت باغی کی سی تھی۔ اگرچہ سرکاری اوقات ۸ بجے صبح سے ۵ بجے شام تک تھے مگر پروفیسر سمیت سب لوگ رات نو دس بجے تک بیٹھے رہتے تھے۔ پوری یونیورسٹی میں یہی رواج تھا۔

میرے لئے یہ ناقابلِ عمل تھا اور میں ۵ بجے ہی چلا جاتا تھا۔ میں نے ساری زندگی کبھی بھی کتابی کیڑے کی طرح کام نہیں کیا۔ میرا انداز بہت مختلف رہا ہے۔ میں نے کبھی پڑھائی کو اپنے پر سوار نہیں کیا۔ کراچی میں اپنے دوسالہ قیام کے دوران میں ہر امتحان سے پہلے رات کو آخری شو ضرور دیکھتا تھا۔ صبح فجر کے بعد تمام سرخیوں پر ایک نظر ڈال لیتا تھا۔ دراصل میں اپنے اہداف امتحان سے ایک دو دن پہلے ہی حاصل کر لیتا تھا۔ اس 'کارکردگی' کے باوجود میں نے یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔

اسی طرح میں نے ملازمت کرتے ہوئے روزانہ صرف دو تین گھنٹے یونیورسٹی جا کر ریکارڈ مدت یعنی ڈیڑھ سال میں تمام مضامین میں اے گریڈ لے کر ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ نہ صرف یہ، میری یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن تھی۔ نتیجہ آیا تو میری اہلیہ کہنے لگیں کہ انہوں نے مجھے کبھی پڑھتے تو دیکھا نہیں، یہ کیسے ہو گیا۔ یہاں یہ بتا تا چلوں کی میری اہلیہ نے ایم بی بی ایس اور میں نے ایم ایس سی شادی کے بعد کی۔

●●●

بظاہر لگتا ہے کہ میرے کام کرنے کا دورانیہ چار پانچ گھنٹے کم تھا مگر یہ صرف آدھا سچ ہے۔ میں صبح ۸ بجے پہنچ کر اپنا کام شروع کر دیتا تھا اور کافی اور لنچ بریک بھی صرف پندرہ پندرہ منٹ کی کرتا تھا۔ میرے ساتھیوں کا معمول یہ تھا کہ نو ساڑھے نو بجے آتے تھے اور ساڑھے دس بجے کافی بریک سے پہلے کوئی خاص کام نہیں کرتے تھے۔ بس چیزیں ادھر ادھر کرنے میں لگے رہتے۔ کافی بریک کے بعد گیارہ بجے کام شروع کرتے۔ لنچ بریک بھی تقریباً ایک گھنٹہ کی ہوتی۔

مگر ان باریکیوں پر کسی کی نظر نہیں تھی۔ کھسر پسر ہونے لگی۔ میرے پروفیسر صاحب شاید خود کچھ نہ کہتے مگر انہیں مجبور کر دیا گیا اور انہوں نے مجھے ٹوکا۔ میں نے جواب دیا کہ ابھی انہوں نے مجھے کسی پروجیکٹ پر تو لگایا نہیں۔ اگر ان کا کچھ کہا میں نے نہ کیا ہو تو بتائیں۔

اس وقت اس سوال کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ مگر جلد ہی انہوں نے جواب ڈھونڈ لیا۔

ایک دن کہنے لگے کہ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ مجھ میں پی ایچ ڈی کرنے کی اہلیت تھی۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اس سکولرشپ کے ساتھ پی ایچ ڈی میں داخلے کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔

پروفیسر طالبِ علم کو اس قابل سمجھتا تو اسے اجازت دیتا ورنہ وہ داخلہ ہوئے بغیر خالی ہاتھ لوٹ جاتا۔ ایک بنگالی ڈاکٹر کی تازہ مثال تھی۔ وہ ڈیڑھ دو سال تک اپنے ڈپارٹمنٹ میں کام کرتا رہا مگر پروفیسر کی توقعات پر پورا نہ اترا اور اسے خالی ہاتھ واپس جانا پڑا۔

پروفیسر صاحب نے کہا تو نہیں مگر انہوں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ مجھے کچھ نہ کچھ آزادی دینی پڑے گی اور میں وہاں کے دستور کے ڈھانچے میں فٹ نہیں ہوں گا۔

انہوں نے بات کو بڑھاتے ہوئے کہا:

'پی ایچ ڈی کی ریسرچ کے لئے ہمارے پاس دو راستے ہیں۔ ایک تو وہ پروجیکٹ ہے جس پر سب کام کر رہے ہیں۔ اس میں تمہیں بنے بنائے پروٹوکول مل جائیں گے مگر کوئی بھی اچھا مقالہ چھاپنے میں دشواری ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈپارٹمنٹ میں اور پوری دنیا میں اس موضوع پر کافی کام ہو چکا ہے۔'

پھر ایک پیٹری پلیٹ (Petri plate) دکھاتے ہوئے بولے:

'دوسرا راستہ یہ ہے کہ یہ جو جراثیم اس پر ہے، اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ تم نے نہ صرف اس کی بڑے پیمانہ پر افزائش کا طریقہ ڈھونڈنا ہے بلکہ اس میں سے ایک خاص زہر (toxin) کو بالکل خالص حالت میں علیحدہ کر کے اس کی خصوصیات معلوم بھی کرنی ہیں۔ اس میں کوئی رہنمائی نہیں۔ اس لئے کہ کوئی شخص اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ناکامی کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ مگر اگر کامیابی ہوگئی تو جو بھی نتیجہ آ تا جائے گا وہ قابلِ اشاعت ہوگا اور تم پوری دنیا میں جانے جاؤ گے۔'

میں نے ایک لمحے کے توقف کے بغیر دوسرے راستے کا چناؤ کر لیا۔ ایک تو مجھے اپنی صلاحیتوں پر اعتماد تھا دوسرا میں شدید تنہائی اور اکتاہٹ کا شکار تھا اور سکولرشپ کی مدت پوری ہونے کے بعد ایک دن بھی جاپان میں رہنے کا روادار نہیں تھا۔

پروفیسر صاحب نے حیرت زدہ مگر تحسین آمیز نظروں سے مجھے دیکھا اور پوچھا:

'کیا یہ تمہارا پکا فیصلہ ہے۔'

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

اب انہوں نے جیب سے ڈپارٹمنٹ کی ایک چابی نکالی اور میرے حوالے کر دی۔

کہنے لگے:

'میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم کب آئے اور کب گئے۔ ہر پیر کی صبح دو گھنٹے ہماری ملاقات ہوگی اور میں دیکھوں گا کہ تم نے پورے ہفتے میں کیا کام کیا ہے۔'

میرے اس فیصلے کی خبر پورے ڈپارٹمنٹ میں پھیل گئی اور لوگ بے یقینی کے انداز میں مجھے دیکھنے لگے جیسے میں نے بہت بڑی حماقت کی ہو۔ مگر جو لوگ اہم تھے یعنی پروفیسر متسودا اور ایسوسی ایٹ پروفیسر سوگی موتو، ان کے رویے سے اعتماد جھلکتا تھا جس سے مجھے بہت حوصلہ ملا۔

•••

اب میں وقت کی پابندی کے حکم سے آزاد ہو چکا تھا۔ اور میرے آنے جانے پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر میں کیا کہوں کہ میرے سر پر ایسی دھن سوار ہوئی کہ میں نے دن میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرنا شروع کر دیا۔ اب میرے سامنے ایک ہدف تھا جسے حاصل کرنا تھا۔ میرے پاس کوئی اور مصروفیت یا تفریح کا ذریعہ نہیں تھا۔ کھانا ہفتہ میں ایک بار پکا کر

فریزر میں رکھ دیتا تھا۔ ویسے زیادہ تر تو کینٹین ہی سے کھانا پڑتا تھا۔

اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے شروع ہی سے میرے ہاتھ میں بڑی صفائی دی ہے۔ اور مجھے لیبارٹریوں میں عملی کام کرنے کا تجربہ بھی کافی تھا۔ اس کے علاوہ اچھوتی راہیں تلاش کرنا بھی میری سرشت میں داخل ہے۔ مگر یہ چیزیں بے معنی ہو جاتی ہیں اگر اللہ کی مدد شامل حال نہ ہو۔ میں پروردگار کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے کہ ہر کام آسانی سے ہوتا گیا۔ جہاں میرا پروفیسر سوچتا تھا کہ میں دو مہینے لگاؤں گا میں وہ نتیجہ ایک ہفتہ میں حاصل کر لیتا تھا۔

پروفیسر صاحب جن کا رویہ پہلے ہی میرے ساتھ بہت اچھا تھا اب مزید مشفقانہ ہو گیا اور وہ مجھے ایک اثاثے کی طرح سمجھنے لگے۔ مثلاً مجھے سکولرشپ لینے کے لئے ہر مہینے دوسرے کیمپس جانا پڑتا تھا۔ انہوں نے فوراً انتظامیہ سے رابطہ کیا اور کہا کہ میرے ریسرچ سکالر کا وقت بہت قیمتی ہے۔ اس کا آدھا دن ضائع ہو جاتا ہے۔ سکولرشپ اس کی میز پر پہنچنا چاہیے۔ وہاں کے کلرک، کلرک بادشاہ نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ پروفیسر کے حکم کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ چنانچہ اگلے مہینے سے ہی ہر پہلی تاریخ کو سکولرشپ میری میز پر پہنچنے لگا۔

اسی طرح انہوں نے سپلائرز کو حکم دیا کہ مجھے جس چیز کی بھی ضرورت ہو فوراً مہیا کی جائے۔ کاغذی کارروائیاں وہ خود کر لیں گے۔ میرے ڈپارٹمنٹ کے پورے قیام کے دوران صرف ایک دفعہ انہوں نے یہ کہا کہ اگر فلاں کی جگہ فلاں چیز منگا لیتے تو کافی پیسے بچ جاتے۔ میں نے معذرت کی اور کہا کہ مجھے قیمتوں کا اندازہ نہیں تھا۔

اس کے علاوہ پروفیسر صاحب کی، یعنی اس پروفیسر کی جس کا شمار جاپان کے ممتاز ترین پروفیسروں میں ہوتا تھا، یہ عادت تھی کہ ڈپارٹمنٹ میں جھاڑو خود دیتے تھے۔ وہ سب سے پہلے آ بھی جاتے تھے۔ میں بھی صبح صبح پہنچ جاتا تھا۔ ایک دو دفعہ میں نے جھاڑو ان کے ہاتھ سے لینے کی کوشش کی مگر انہوں نے مجھے ڈانٹ کر بھگا دیا کہ جاؤ اپنا کام کرو۔ تمہارا وقت میرے وقت سے زیادہ قیمتی ہے۔

مگر عملی طور پر مجھے سب سے زیادہ رہنمائی ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر سوگی موتو سے مل رہی تھی۔ پہلے ہی دن ایک مسئلہ لے کر ان کے پاس پہنچا تو کہنے لگے:

'تم پی ایچ ڈی کے طالب علم ہو خود ہی حل تلاش کرو۔ مجھے یقین ہے کہ تم ایسا کر لو گے۔'

ان الفاظ نے مجھ میں خود انحصاری اور خود اعتمادی کوئی گنا زیادہ کر دیا۔
باقی لوگوں کے رویے متفرق تھے۔ ان کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔

●●●

اللہ کی رحمت اور اس مثبت ماحول میں دن رات کام کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو اہداف مجھے دیے گئے تھے وہ میں نے صرف چھ مہینے میں حاصل کر لئے۔

پروفیسر صاحبان بہت خوش تھے۔ پروفیسر متسودا کہنے لگے:

'تم نے پی ایچ ڈی کا کام جو لوگ چار سال میں کرتے ہیں، چھ مہینے میں کر لیا ہے۔ میری طرف سے تمہاری پی ایچ ڈی مکمل ہو گئی۔ مگر یونیورسٹی تمہیں چار سال مکمل ہونے پر ہی ڈگری دے گی۔ اور ابھی تمہارے سکولر شپ کے بھی تقریباً دو سال پڑے ہیں۔ مین ڈش تم نے تیار کر لی ہے۔ اب ایسا کرتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے باقی لوازمات تیار کرتے ہیں تاکہ دعوت اور پُر تکلف اور شاندار ہو جائے۔'

چنانچہ میں نے چھوٹے چھوٹے پروجیکٹ مکمل کرنے شروع کر دیے۔ اب کوئی ذہنی تناؤ نہیں تھا۔ کوئی ٹوکنے والا نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جاپان کے قیام کے دوران جہاں صرف ایک بڑے ریسرچ پیپر کی ضرورت تھی، میں نے آٹھ ریسرچ پیپر دنیا کے بہترین جریدوں میں چھاپے۔

●●●

میرے ڈپارٹمنٹ میں دو کلیدی شخصیات یعنی پروفیسر متسودا اور ایسوسی ایٹ پروفیسر سوگی موتو کے علاوہ جو لوگ تھے ان میں طالب علم زیادہ تھے۔

ڈاکٹر ہوری گوچی (Horiguchi) اور ڈاکٹر اوکابے (Okabe) لیکچرار تھے۔ ہوری گوچی تیز طرار، ہوشیار، ہر کام میں آگے بڑھ کر حصہ ڈالنے والوں میں سے تھے۔ انگریزی بھی اچھی تھی اور سائنس بھی۔ اوکابے اس کے بالکل الٹ تھے۔ خاموش اور کم گو۔ اس کی ایک وجہ کمزور انگریزی تھی، بولنے کی حد تک۔ مگر میں نے انہیں جاپانیوں کے ساتھ بھی زیادہ بات کرتے نہیں دیکھا۔

طالب علموں میں سب سے سینیئر چینی جوڑا لی اور مسز لی تھے۔ لی تو پی ایچ ڈی کر رہا تھا۔ اس کی بیگم ویسے ہی تجربہ حاصل کر رہی تھی۔ دونوں بہت با اخلاق تھے اور کام میں بھی ہوشیار تھے۔

اس کے علاوہ انڈونیشیا کی کلارانتی مختصر مدت کے لئے آئی ہوئی تھی۔

چین ہی سے ما(Maa) بھی تھا۔ وہ پی ایچ ڈی کرنا چاہتا تھا مگر پروفیسر متسودا کے معیار پر پورا نہیں اتر تا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولتا تھا اور بہت ہنس مکھ تھا۔

ایک اور خاص بات تھی۔ وہ مسلمان تھا۔ مگر ایسا مسلمان جسے کلمہ بھی نہیں آتا تھا۔ بدقسمتی سے ایسے مسلمان غیر ممالک میں بکثرت ملتے ہیں۔ نہ صرف ایسے ممالک سے جہاں غیر مسلم حکومتیں ہیں اور مسلمان بہت کم تعداد میں ہیں مثلاً چین، بلکہ ایسے ممالک سے بھی جو سرکاری طور پر مسلمان ہیں۔

میں نے سوچا کہ کچھ ثواب کما لوں۔ میں نے ما کو کلمہ سکھایا اور پھر جمعہ کی نماز پر لے جانے لگا۔ یہ نماز کینٹین کے نزدیک ہی ایک چھوٹے سے ہال میں ہوتی تھی۔ دو تین دفعہ تو وہ میرے ساتھ گیا پھر اس نے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگا:

'مجھے لگتا ہے کہ میں چین کے جاسوس اداروں کی نظر میں آ گیا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ واپس چین جانے پر مجھے مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔'

مجھے مایوسی ہوئی مگر میں کیا کر سکتا تھا۔

طالبِ علموں میں ایک جاپانی خاتون بھی تھی جس کا نام ہارادا(Harada) تھا۔ وہ ایک عجیب و غریب کردار تھا۔ جاپان میں بھی سفارش چلتی ہے۔ پروفیسر صاحب کے کسی بہت عزیز دوست کے کہنے پر وہ آئی تھی۔ کسی اور جگہ پی ایچ ڈی کی کوشش کرتی رہی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اب وہ پورے ڈپارٹمنٹ کے سر پر سوار تھی۔

ہارادا ہر وقت سگریٹ پیتی رہتی مگر روائتی دھویں والے سگریٹ نہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کس نوعیت کے سگریٹ تھے۔ الیکٹرانک سگریٹ بہت بعد میں آئے۔

وہ کام کے وقت میٹھی بن جاتی مگر دراصل وہ انتہائی متعصب اور نسل پرست تھی۔ اس نے کئی دفعہ مجھ پر اور پاکستان پر لفظی حملے کئے۔ میں نے نہ صرف خاطر خواہ جواب دیا مگر بات اپنے اساتذہ تک پہنچائی۔ وہ بہت شرمندگی محسوس کرتے اور اس کی طرف سے معافی مانگتے۔

میں نے دیکھا کہ میرے شکایت لگانے سے میرے اساتذہ ناحق مشکل میں پڑ جاتے ہیں اور انہیں ایسا معذرتانہ رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے جو کسی طور بھی مناسب نہیں اور الٹا مجھے شرمندگی

ہوتی ہے۔ اس وجہ سے میں نے معاملات اپنے تک ہی رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ اس سے بول چال بالکل بند کر دی اور مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ کام میں وہ بالکل کمّی تھی اور اسے ہر وقت رہنمائی کی ضرورت تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ اساتذہ ڈپارٹمنٹ میں نہ ہوتے۔ ایسی صورت میں اسے لامحالہ مجھ سے رجوع کرنا پڑتا۔ اس مجبوری کی وجہ سے اس کی زہر فشانی ختم ہوگئی اور میں نے بھی اپنے رویے میں تبدیلی کر لی۔

•••

۴

جب میں نے اوسا کا یونیورسٹی جانا شروع کیا تو جس تنہائی کا سامنا تھا اس کا ذکر کر چکا ہوں۔ ٹی وی پر مقامی خبریں ہی ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی کسی عالمی خبر کو جگہ مل جاتی تھی۔ پاکستانی خبر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایسے میں بیرونی دنیا میں جھانکنے کے لئے ایک ہی کھڑکی تھی۔ انگریزی کا اخبار جاپان ٹائمز جو انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں روزانہ آتا تھا۔

اس اخبار میں پاکستان کے بارے میں اکثر کچھ نہ کچھ پڑھنے کو مل جاتا تھا اگرچہ لکھنے والے مغربی عینک کا استعمال ہی کرتے تھے۔ مگر ایک حیرت انگیز بات تھی۔ سپورٹس کے صفحے پر کرکٹ کی کافی خبریں مل جاتی تھیں۔ حیرت انگیز اس لئے کہ جاپان میں کرکٹ کو شاید ہی کوئی جانتا ہو۔ میرے لئے کرکٹ ہمیشہ ہی ایک گوشہ عافیت رہا ہے اور اس معاملہ میں میں زاہد باعمل ہوں۔ جاپان جانے سے پہلے تک میں شہر کے سب سے پرانے کلب میں پندرہ سال کھیلا اور تین چار سال کپتانی بھی کی۔ اس دوران پاکستان کے کئی نامور کھلاڑیوں کے ساتھ کھیلنے کا موقع بھی ملا۔

ان دنوں ویسٹ انڈیز میں پاکستان ویسٹ انڈیز سیریز ہو رہی تھی۔ اس زمانے میں کالی آندھی پوری رفتار سے چل رہی تھی اور ایک ہی ٹیم اس کے سامنے کھڑی ہو سکتی تھی، اور وہ تھی پاکستان۔ اس سیریز میں اگر ویسٹ انڈین امپائر کھلی بے ایمانی نہ کرتے تو پاکستان جیت جاتا۔ پاکستان سیریز برابر کرنے میں کامیاب رہا۔ یہی بہت بڑی بات تھی۔ اس سیریز کو کرکٹ کی تاریخ کی عظیم ترین سیریز میں شامل کیا جاتا ہے۔

جاپان ٹائمز میں نہ صرف سکور کارڈ مل جاتا تھا بلکہ مختصر سا تبصرہ بھی ہوتا تھا۔ یہ میرے لئے کسی نعمت سے کم نہ تھا۔

●●●

ایک دن میں لائبریری میں جاپان ٹائمز پڑھ رہا تھا تو مجھے کسی نسوانی آواز نے ہیلو کہا۔ سر اُٹھا کر دیکھا تو ایک مغربی خاتون کھڑی تھی۔ وہ میرے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی اور تعارف ہوا۔ اس کا تعلق ترکی سے تھا۔ نام شفق یالچن تھا۔ میڈیکل سپیشلسٹ تھی اور وائرولوجی میں پی ایچ ڈی کرنے آئی تھی۔ عمر تقریباً تیس سال تھی۔ چھ سات سال کی ایک بیٹی تھی مگر بیٹی اور خاوند استنبول میں ہی تھے۔

میں نے جب سے انسٹیٹیوٹ آنا شروع کیا تھا وہ پہلی گائی جن (gaijin) تھی جو مجھے ملی یا ملا۔ جاپان میں ہر اس شخص کے لئے جس کا تعلق جاپان، چین یا کوریا سے نہ ہو یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ میں بھی شفق کو نظر آنے والا پہلا گائی جن تھا اس لئے دعا سلام بڑھنا فطری تھا۔ ہم میں ایک اور قدر مشترک تھی۔ اچھی انگریزی اور کمزور جاپانی۔ میں تو پھر بھی چھ مہینے میں کچھ نہ کچھ جاپانی سیکھ گیا تھا، وہ سیدھی یونیورسٹی ہی آئی تھی اور جاپانی کے دو چار الفاظ بھی نہیں جانتی تھی۔

جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ بہت پیچیدہ شخصیت تھی۔ خاوند سے ناراض تھی مگر بیٹی کو یاد کرتی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے جاپانیوں کی ہر چیز میں عیب نظر آتا تھا۔ اس وجہ سے وہ شدید ڈپریشن کا شکار تھی۔

مگر سب سے نمایاں چیز اس کا سیماب صفت مزاج تھا۔ اچھے موڈ میں بات کر رہی ہے، اچانک کوئی بے ضرر لفظ برا لگا یا کچھ یاد آ گیا تو مزاج بگڑ گیا۔ ایک دو دفعہ تو میں نے برداشت کیا۔ پھر میں نے سخت رویہ اپنانا اور اسے نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ وہ بھی جواباً ایسا ہی کرتی۔ مگر اس کے پاس اپنے دکھڑے سنانے اور بات کرنے کے لئے کوئی اور نہیں تھا۔ دو چار دنوں میں ہی وہ معافی مانگ لیتی اور حالات معمول پر آ جاتے۔

وہ دل کی بری نہیں تھی اور بہت حساس تھی۔ ایک دن کسی ریلوے سٹیشن پر سکول کے بچوں نے اس کی طرف اشارہ کیا اور اونچی آواز میں 'گائی جن، گائی جن' کہنا شروع کر دیا۔ اس کا اس پر اتنا منفی اثر ہوا کہ کئی دن یونیورسٹی نہیں آئی۔

ترک لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ یا تو بہت مذہبی یعنی اچھے مسلمان یا بالکل مغرب زدہ۔ دوسری قسم کے لوگ بہت زیادہ ہیں۔ شراب پینا ان کا روزمرہ کا معمول ہے مگر ایک چیز ضرور ہے کہ وہ سؤر کا گوشت نہیں کھاتے گرچہ میں نے ایک دو کو دیکھا جنہوں نے اس حد کو بھی عبور کر لیا۔ شفق بھی مغرب زدہ تھی اور بہت آزاد خیال تھی۔

جاپانی خواتین اس کی اچھی شکل وصورت کی وجہ سے حسد کرتی تھیں اور دور دور رہتی تھیں اور مرد اس سے مرعوب رہتے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ اسے اپنے پر بڑا غرور تھا۔

لطف یہ ہے کہ جاپانیوں کو اتنی بری نظر سے دیکھنے والی آخر کار ایک جاپانی سے ہی شادی کر بیٹھی۔ ترک شوہر سے تو اس کی ویسے ہی نہیں بنتی تھی اور جن خیالات کی وہ مالک تھی، اسے رشتہ توڑنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی۔

اس کا جاپانی شوہر ناکاجیما توشی ہیرو اس سے دس سال چھوٹا تھا اور واجبی سا تعلیم یافتہ تھا۔ ایسا بے دام غلام اسے کوئی اور نہیں مل سکتا تھا۔ مجال ہے کہ اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات کرے۔ شفق کی حد سے بڑھی ہوئی انا کی تسکین کے لئے وہ بہت بڑا سہارا تھا۔

اس طرح میری جان چھوٹی۔ مگر دعا سلام اور ملنا ملانا برقرار رہا۔ شوہر کی شکائتیں لگانے کے لئے بھی تو اسے کسی کی ضرورت تھی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کی سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ وہ کوئی جرح نہیں کرتا اور ہر بات فوراً مان جاتا ہے۔ یعنی وہ انسان نہیں روبوٹ ہے۔ وہ یہ شکائتیں عادت سے مجبور ہو کر کرتی۔

جاپانی سے شادی کرنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس نے جاپان کو بھی قبول کر لیا۔ توشی ہیرو کو تو اس نے اس کے خاندان سے چھین کر ایک قسم کا پنجرے میں بند کر لیا تھا۔ ویسے توشی ہیرو بہت بھلا مانس آدمی تھا اور میرا بڑا اچھا دوست بنا۔

اپنے پہلے خاوند سے طلاق لینے کے بعد شفق نے اپنی بیٹی عائشہ کو بھی بلا لیا اور جیسے ہی اس کا سکولرشپ ختم ہوا یہ لوگ کینیڈا چلے گئے اور بعد میں استنبول میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

•••

شفق نے ایک دن مجھے ایک آنکھوں دیکھا واقعہ سنایا۔ وہ کسی ہسپتال گئی تو وہاں ڈاکٹر ایک جاپانی جوڑے کو ان کے بچے کے بارے میں کوئی بری خبر دے رہا تھا۔ وہ خبر سن کر دونوں نے

کوئی ردعمل نہیں دیا نہ ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آئے۔ اچانک بچے کی ماں ایک لکڑی کے ٹکڑے کی طرح زمین پر گری اور بے ہوش ہوگئی۔ اس نے اپنے غم کو ظاہر نہیں ہونے دیا مگر اندرونی طوفان اتنا شدید تھا کہ اس کے ہوش لے اڑا۔

جاپانی اپنے قدرتی نظم وضبط کی وجہ سے جذبات پر قابو پانا خوب جانتے ہیں۔ میں نے اپنے پانچ سالہ قیام کے دوران کہیں بھی، ٹرین میں، سڑک پر، سٹیشن پر یا کسی اور جگہ دو جاپانیوں کو غصے میں بات کرتے نہیں دیکھا۔ ہاتھا پائی کا تو تصور ہی نہیں۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شرح خواندگی سو فیصد ہے اور اس کا مطلب صرف دستخط کرنا نہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ غربت نہیں۔ تیسری وجہ تقریباً سب لوگوں کا ایک ہی معیار زندگی اور چوتھی وجہ وسائل کی منصفانہ تقسیم ہے۔ جیسا کہ میں سکولوں کی مثال دے چکا ہوں۔

●●●

۵

میرے انسٹیٹیوٹ میں ہر دس پندرہ دن کے بعد کسی دعوت کا اہتمام ہوتا تھا۔کوئی نہ کوئی وجہ بنتی رہتی تھی۔ان موقعوں پر بہترین جاپانی کھانے منگوائے جاتے تھے۔یہ ہم طالب علموں کے لئے نادر مواقع ہوتے تھے کیونکہ بازار سے جاپانی کھانا کھانا ہماری پہنچ سے باہر تھا۔

ہم بازار میں ہوتے تو میکڈونلڈ، کے ایف سی، یا برگر کنگ کو تلاش کرتے۔اس لئے کہ وہاں کا خرچہ سستے سے سستے جاپانی ریستوران سے آدھا ہوتا تھا۔اسی لئے جاپان میں طالبِ علموں کی حد تک تو یہ مغربی ریستوران قابلِ قبول تھے مگر عام آدمی کا وہاں جانا غربت کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ہمارے ہاں یہ معاملہ الٹا ہے اور یہ فوڈ چینز سٹیٹس سمبل ہیں۔

جاپانی کھانوں کو دنیا کی بہترین خوراک میں شمار کیا جاتا ہے۔آپ پیٹ بھر کر بھی کھا لیں تو سستی بالکل طاری نہیں ہوتی۔وجہ یہ ہے کہ ان کھانوں کی تیاری میں کوکنگ آئل کا استعمال بہت کم ہوتا ہے۔ان کھانوں سے مانوس ہونے میں کچھ دیر ضرور لگتی ہے مگر رفتہ رفتہ آپ ان کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔

روائتی جاپانی دسترخوان کو واشوکو (washoku) کہا جاتا ہے۔اس کا بنیادی جز چاول ہیں۔مگر یہ چاول ہمارے چاولوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ہمارے ہاں باریک، لمبے دانے اور پکنے کے بعد الگ الگ کھڑے رہنے والے چاول بہترین سمجھے جاتے ہیں جیسے باسمتی چاول۔ جبکہ جاپان میں بہترین چاول کا معیار چھوٹا، موٹا اور لیس دار ہونا ہے۔

ڈاکٹر تبسم نے ایک دفعہ ذکر کیا کہ انہوں نے کسی جاپانی خاتون کو بہترین باسمتی چاول تحفے کے طور پر دیے۔ بعد میں اس کی رائے جاننا چاہی تو وہ کتراتی رہی۔ آخر ایک دن بول پڑی کہ وہ تو اس کے کتے کو بھی پسند نہیں آئے۔

چاولوں کے ساتھ میسو (miso) سوپ، مچھلی، سویا ساس (soy sauce)، سبزیوں کا اچار اور شوربے والی سبزیاں کھانے کا حصہ ہوتی ہیں۔ سمندری خوراک کی بھی بہت اہمیت ہے۔ اس کے علاوہ نوڈل بھی عام طور پر کھائی جاتی ہیں۔

جاپان میں روائتی طور پر سرخ گوشت کو پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ زمانہ قدیم میں تو چار ٹانگوں والے جانور کا گوشت کھانا بہت معیوب تھا۔ مغربی دخل اندازی کے بعد صورتِ حال رفتہ رفتہ بدلتی گئی اور اب اس کا استعمال عام ہے۔

سرخ گوشت میں سب سے مہنگا اور پسندیدہ گائے کا گوشت ہے۔ اور اس میں سب سے مہنگا 'کوبے بیف' ہے جس کی قیمت اس زمانے میں چودہ سو روپے فی کلو تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ان جانوروں کو پیدائش کے بعد ہی سے پانی کی بجائے بیئر پلائی جاتی ہے۔ عموماً گوشت کو باریک پارچوں میں کاٹ کر سوپ میں ڈبو کر کھایا جاتا ہے۔

●●●

جاپانی دسترخوان کی مشہور ترین چیزیں سوشی (sushi)، ساشی می (sashimi, rawfish) ہیں۔

سوشی میں چاول کے رول کے اندر مختلف چیزیں مثلاً مچھلی اور ابلی سبزیاں بھر دی جاتی ہیں۔ رول کے باہر سمندری جڑی بوٹی نوری (nori) کو چپکا دیا جاتا ہے۔ اکثر جاپانی نوری کو سنیک کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔

ساشی می مصالحوں سے تیار کردہ مچھلی ہوتی ہے یعنی اس میں پکانے کا عمل بالکل نہیں ہوتا۔ اسی لئے اسے raw fish بھی کہا جاتا ہے۔ اسے بھی باریک قتلوں میں کاٹا جاتا ہے اور چاول، سبزیوں وغیرہ کے ساتھ ملا کر کھایا جاتا ہے۔

تمپورا (tempura) میں seafood کو تلا جاتا ہے۔ نوڈلز گندم سے بنتی ہیں اور اب ان کا استعمال زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔

جاپانی ایک خاص مچھلی بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔اسے جاپانی زبان میں فوگو (fugo) اور انگریزی میں pufferfish کہتے ہیں۔اس کا پکانا بچوں کا کھیل نہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے کچھ جسمانی اجزا انتہائی زہریلے ہوتے ہیں جن سے موت بھی واقع ہوسکتی ہے۔انہیں پہچاننے اور علیحدہ کرنے کے لئے خاص مہارت اور تجربے کی ضرورت ہے۔اسی وجہ سے اس کے لئے علیحدہ ریسٹورنٹ ہوتے ہیں جنہیں سرکاری سٹوفکیٹ ملا ہوتا ہے۔یہ بہت مہنگی ہوتی ہے اور خاص موقعوں پر ہی ان ریسٹورنٹوں کا رخ کیا جاسکتا ہے۔ایک دفعہ ہمارے ڈپارٹمنٹ کا سالانہ ڈنر اسی ریسٹورنٹ میں ہوا تھا۔

روایتی جاپانی مٹھائی کو واگاشی (wagashi) کہا جاتا ہے۔اس میں سرخ لوبیے کا بہت استعمال ہوتا ہے۔

جاپانی عام طور پر کافی بہت پیتے ہیں۔مگر روایتی جاپانی چائے کی بھی بڑی تہذیبی اہمیت ہے۔اس کا تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا۔

مختلف علاقوں میں پکانے کے اپنے طریقے ہیں اور ذائقہ بھی مختلف ہو جاتا ہے۔جیسے ہمارے ہاں ایک ہی ڈش جب پنجاب اور کراچی میں پکتی ہے تو ذائقہ بدل جاتا ہے۔پروفیسر متسوداکو اوساکا کے پکوان پر فخر تھا۔ان کے بقول اوساکا والے ٹوکیو والوں کی طرح کھانے کا اصل ذائقہ مسالوں میں دفن نہیں کر دیتے تھے۔

•••

جاپانی کھانے کے لئے کانٹے چمچے کی بجائے چوپ سٹک (chopstick) استعمال کرتے ہیں۔یہ لکڑی کی بنی ڈنڈیاں ہوتی ہیں۔انہیں استعمال کرنا آسان نہیں۔خاص طور پر مہنگی والی چوپ سٹکس جنہیں پالش کیا جاتا ہے۔مگر جاپانی چاول کا ایک ایک دانہ اٹھا لیتے ہیں۔اگر ایسا نہ کریں تو یہ برے آداب میں شامل ہوتا ہے۔میں مہارت کی اس انتہا تک تو نہ پہنچ سکا مگر انہیں تسلی بخش حد تک استعمال کر لیتا تھا۔پروفیسر متسودا اکثر کہا کرتے تھے:

"your use of chopsticks is much better than your use of japanese language"

چوپ سٹک کو استعمال کرنے کے آداب کی بڑی اہمیت ہے۔انہیں کبھی بھی چاول کے

پیالے میں سیدھا یعنی عمودی نہیں رکھا جاتا کیونکہ اس طرح وہ ان اگر بتیوں کی طرح لگتی ہیں جو کسی کے مرنے کی رسومات میں جلائی جاتی ہیں۔

●●●

توہمات کا ذکر چل پڑا تو یہ بات بہت حیرت انگیز ہے کہ دنیا کی ترقی یافتہ ترین قوموں میں سے ایک، جس میں شرح خواندگی سو فیصد ہے، کس حد تک توہمات میں گھری ہوئی ہے۔

بات ہندسوں سے شروع کرتے ہیں۔ اگر انہیں بولتے ہوئے آواز کسی اچھی آواز سے ملتی ہے تو وہ اچھے ہیں۔ اگر یہ مماثلت کسی بری آواز سے ہے تو وہ براشگون ہیں۔

آٹھ، نو اور دس اچھے ہندسے شمار ہوتے ہیں۔ جبکہ ۴ سب سے برا ہندسہ سمجھا جاتا ہے۔ اسے جاپانی میں 'شی' کہتے ہیں جس کا مطلب موت بھی ہے۔ اسی لئے کئی ہوٹلوں اور ہسپتالوں میں آپ کو چوتھی منزل نہیں ملے گی۔ یعنی چوتھی منزل کو پانچویں کہا جاتا ہے۔ اس طرح پانچویں چھٹی ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ کسی کو برتنوں وغیرہ کا سیٹ تحفہ دینا ہو تو ان کی تعداد کبھی چار نہیں ہوتی۔ تین یا پانچ یا زیادہ ہوتی ہے۔

سات بھی منحوس ہندسہ ہے۔ اس لئے کہ اس کا لکھا جانا خودکشی کے لکھے جانے سے مشابہہ ہے۔ مغرب میں ۱۳ کو براشگون سمجھا جاتا ہے اور جاپانیوں نے بھی اسے برا سمجھنا شروع کر دیا ہے۔

اسی طرح ہسپتالوں کے زچہ خانوں میں ۴۳ نمبر کا بستر نہیں ہوتا وجہ یہ کہ اس کا تلفظ مردہ بچے کی پیدائش سے ملتا ہے۔ کاروں یا کسی اور گاڑی کو ۴۲ نمبر نہیں دیا جاتا۔

مردوں کے لئے ۲۵، ۴۲، اور ۶۱ سال کی عمر اور عورتوں کے لئے ۱۹، ۳۳، اور ۳۷ سال کی عمر خطرناک سمجھی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ چند دلچسپ توہمات درج ذیل ہیں:

۱۔ کسی فوتگی کے گھر سے آئیں تو اپنے گھر میں داخل ہونے سے پہلے پاکیزہ ہونے کے لئے سر پر نمک چھڑک لیں۔

۲۔ کبھی بھی شمال کی طرف سر کر کے نہ سوئیں۔ اس سے عمر کم ہو جاتی ہے۔

۳۔ رات کو ناخن نہ کاٹیں۔ ایسا کریں گے تو والدین کے آخری وقت میں انہیں دیکھنا نصیب نہیں

ہو گا۔

۴۔ کبھی بھی کسی شخص کا نام سرخ روشنائی سے نہ لکھیں۔اس لئے کہ یہ رنگ قبروں کی نشاندہی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

۵۔ بلی اچھی قسمت کی نشانی ہے۔اس لئے کئی دوکانوں کے باہراس کے چھوٹے چھوٹے مجسمے رکھے ملتے ہیں۔

۶۔ اگر صبح کومکڑی نظر آ جائے تو اسے مارنا نہیں چاہیے۔مگر رات کونظر آئے تو فوراً ماردیں۔

۷۔ اگر کسی کوے نے آپ کی طرف دیکھ لیا تو سمجھیں کہ کچھ برا ہوگا۔

۸۔ کوئی جنازہ جارہا ہوتو اپنے انگوٹھے چھپالیں۔اگر ایسا نہ کیا تو آپ کے والدین وقت سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو سکتے ہیں۔

۹۔ رات کوسیٹی نہ بجائیں۔کوئی چوریا سانپ گھر میں داخل ہوسکتا ہے۔

۱۰۔ اگر کسی کا برا چاہتے ہیں تو مندر میں رات کے وقت ایک اور تین بجے کے درمیان جائیں۔ ساتھ میں ایک گڑیا اور کچھ کیل لے جائیں۔اور مندر کے کسی درخت کے ساتھ گڑیا کوگاڑ دیں۔

۱۱۔ چٹائی کے کنارے پر پاؤں نہ رکھیں۔

اس کے علاوہ جاپانیوں کی ایک بڑی تعداد روحوں اور بھوتوں پر یقین رکھتی ہے۔کوئی تصویر کھینچی اور اس میں کم روشنی کی وجہ سے کچھ مدھم نظر آیا تو اس میں کسی بھوت کا چہرہ ڈھونڈ لیا جاتا ہے۔

اس ساری تفصیل کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اگر چہ جاپانیوں نے حیرت انگیز ترقی کی ہے مگر وہ ہماری طرح عام انسان ہیں اور وہی کمزوریاں جو انسانی فطرت کا بنیادی جز ہیں، ان میں بھی موجود ہیں۔فرق یہی ہے کہ وہ کئی صدیوں سے منظم زندگی گزار رہے ہیں اور اپنے ملک سے عملی طور پر بے حد محبت کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں زبانی جمع خرچ تو بہت ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ دنیاوی اور قدرتی آفات کے وقت کے علاوہ ہم ایک ہجوم ہی ہیں، قوم نہیں بن سکے۔

ہم ابھی تک غلامی کی نفسیات سے باہر نہیں نکل سکے۔

●●●

۶

اللہ کے فضل سے میرا کام اچھا جا رہا تھا اور نتائج بھی تسلی بخش تھے۔ پیر کے دن صبح میں پروفیسر صاحب کے سامنے اپنا کام پیش کرتا تھا۔ باقی سب لوگ بھی بیٹھے ہوتے تھے۔ اس لئے سب آگاہ تھے۔

میری وہ عمر تو نہیں تھی یعنی لڑکپن کبھی کا گزر چکا تھا مگر نہ جانے مجھے کیا سوجھی کہ میں نے حلیہ تبدیل کر لیا۔ میں ہپی بن گیا۔ لمبے بال، بڑی بڑی لٹکتی مونچھیں، بغیر بٹنوں کی ٹی شرٹ اور جین میرا لباس بن گئے۔

سب لوگ مجھے حیرت سے دیکھتے تھے، کہتے کچھ نہیں تھے۔ مگر یہ صاف ظاہر تھا کہ ان سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

دراصل جاپان میں خود کو دوسروں سے منفرد کر کے پیش کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ انفرادیت کو دبا دیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ کسی ایک جاپانی میں آپ کو کوئی قابلِ ذکر بات شاید ہی نظر آئے مگر جب وہ دو ہو جاتے ہیں تو آٹھ دس کے برابر ہو جاتے ہیں۔ اور دس پندرہ کا گروپ تو چھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اتنی ترقی یافتہ قوم ہونے کے باوجود آپ کو عالمی سطح پر کوئی تاریخ ساز جاپانی نام نہیں ملتا۔ اس کے برعکس مغرب میں انفرادیت کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور پچھلی کئی صدیوں میں دنیا پر غلبہ میں اس رجحان کا بڑا ہاتھ ہے۔

ہمارے ملک میں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس حوالے سے کوئی بھی خیر کا پہلو نہیں۔

ہمارا ایک آدمی تو شاندار نظر آ سکتا ہے مگر جب دو کی ٹیم بن جاتی ہے تو نتیجہ صفر ہو جاتا ہے (یہ میں ایک عمومی بات کر رہا ہوں ورنہ بہت اچھی مثالیں بھی موجود ہیں)۔ دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ اور اگر اکیلے آدمی نے کامیابی حاصل کر لی ہے تو وہ بجائے دوسروں کو ساتھ لے کر چلنے کے اسے چھپا چھپا کر رکھتا ہے۔

اس کی بڑی مثال حکمت ہے۔ ہمارے قدیم حکما کے سب معترف تھے مگر آہستہ آہستہ یہ شعبہ زوال پذیر ہوتا گیا اور اب یہ حالت ہے کہ انگریزی دوائیں پڑیوں میں بند کر کے دی جاتی ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ان قدیم حکما نے اپنا علم عام نہیں کیا۔ یہ میراث بن کر نسل در نسل چلتا رہا۔ اس کا خاص اہتمام کیا جاتا رہا کہ کسی اور کو ہوا نہ لگنے پائے۔

اس کے برعکس مغربی طب میں سائنسی جریدوں کا رواج ڈالا گیا۔ جونئی پیش رفت ہوتی تھی سب تک پہنچتی تھی۔ پڑھنے والے نئی راہیں تلاش کرتے اور اس طرح یہ پروان چڑھتا رہا۔

●●●

بات اور طرف نکل گئی۔

میرے پروفیسر صاحب نے دنیا دیکھی ہوئی تھی اس لئے ان کے ضبط کا پیمانہ بڑا تھا۔ انہوں نے بھی کئی دفعہ اشاروں کنایوں سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا مگر میں نے نظر انداز کر دیا۔

مگر ایک دن ان کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا۔ دراصل میری مونچھیں بہت ناپسندیدہ تھیں۔ کہنے لگے:

'جاپان میں سب سے الگ نظر آنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔'

پتہ نہیں میرے سر پر کیا بھوت سوار تھا کہ میں نے پھر بھی اپنا حلیہ تبدیل نہیں کیا۔

ایک دو مہینے بعد یعنی اکتوبر ۱۹۸۹ عیسوی میں میں نے گھر کا چکر لگانے کی اجازت چاہی۔

ایک سال ہو گیا تھا۔ گھر والے بھی اداس تھے اور میں بھی۔ پروفیسر صاحب نے باخوشی اجازت دے دی۔

فیصل آباد ائر پورٹ میں اب تو کافی توسیع ہو گئی ہے مگر اس زمانے میں بہت چھوٹا تھا اور مسافروں کے عزیز و اقارب انہیں جہاز کی سیڑھیوں سے اتر کر سامان لینے والے ہال تک

جاتے آسانی سے دیکھ سکتے تھے۔

جب میں اس حلیے میں جہاز سے اترا تو مجھے کسی نے نہیں پہچانا۔ حتیٰ کہ میری بیگم نے بھی میرے پرانے حلیے کے مطابق کسی آدمی کو ڈھونڈ لیا اور سمجھی کہ میں ہوں۔

جلد ہی صورتِ حال سب پر واضح ہوگئی۔ میری والدہ، دونوں ماموں جان، بہن بھائی اور بیوی بچوں کے چہروں پر کئی سوال لکھے نظر آ رہے تھے مگر غالباً وہ گھر پہنچنے کا انتظار کر رہے تھے۔

مگر بچے کسی مصلحت کے پابند نہیں ہوتے۔ یہ محاذ ائرپورٹ پر ہی گرم ہوگیا۔ میری چھوٹی بیٹی حنا بگڑ گئی اور اس نے میرے پاس آنے سے صاف انکار کر دیا۔ شرط یہ تھی کہ پہلے میں اپنی مونچھیں صاف کروں۔ چارو نا چار نہیں، بڑی خوشی سے میں نے گھر پہنچتے ہی پہلا کام یہی کیا اور اس طرح میرے اور حنا کے درمیان عارضی طور پر قائم ہونے والی 'دیوار برلن' ٹوٹ گئی۔

مونچھیں گئیں تو لمبے بالوں کا کیا کام۔ اگلے دن میں نے حجامت بھی کروالی اور بقول شخصے انسانوں والے حلیے میں آ گیا۔ جب یہ تبدیلیاں خود بخود رونما ہوگئیں تو کسی کو سوال کرنے کی حاجت نہیں رہی۔

جب میں وطن سے واپس جاپان پہنچا اور اپنے ڈیپارٹمنٹ گیا تو سب لوگ حیران رہ گئے۔ پروفیسر صاحب نے فوراً دوبارہ 'انسانی حلیہ' میں آنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے کہا کہ جو کام کوئی نہ کر سکا وہ میری ننھی سی بیٹی نے کر دیا۔

اس دن کے بعد میں نے دوبارہ ہپی بننے کی کوشش نہیں کی۔ انسان کی زندگی میں ایسے بے تکے ادوار آ ہی جاتے ہیں۔

•••

باب سوم
(نومبر ۱۸۸۹ تا اپریل ۱۹۹۱ عیسوی)

۱

جاپان ہی نہیں، تمام ترقی یافتہ ممالک کی ترقی کی بنیادی وجوہات میں سے ایک وقت کی قدر پہچاننا ہے۔

وقت کی پابندی میں جاپانیوں کا کوئی ثانی نہیں۔ وہاں تو فاصلے بھی گھنٹوں اور منٹوں میں ناپے جاتے ہیں۔ میں تین سال تسوگومودائی ہاسٹل میں رہا۔ روز یونیورسٹی جانے کے لئے یامادا سٹیشن سے صبح ساڑھے سات بجے ٹرین پر بیٹھتا تھا۔ میری ٹرین جنوب کی طرف سے آتی تھی۔ عین اس وقت جب میری ٹرین پلیٹ فارم پر رکتی تھی، شمالی سمت سے ایک ٹرین دوسرے پلیٹ فارم پر ٹھہرتی تھی۔ تین سال کے دوران ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ میری ٹرین آ گئی ہو اور دوسری ٹرین اپنے پلیٹ فارم پر نہ پہنچی ہو۔ دونوں کا سٹاپ ایک منٹ کا تھا۔ یعنی اگر کبھی کسی ٹرین کو دیر ہوئی تو سیکنڈوں کے حساب سے۔ بات منٹ تک نہیں پہنچی۔ ہمارے پیمانے پر یہ افسانوی بات لگتی ہے مگر سچ ہے۔

جیسا میں نے کہا، فاصلہ وقت میں ناپا جاتا ہے۔ مثلاً ہر سٹیشن پر بورڈ لگا ہوتا ہے، ٹوکیو تین گھنٹے بیس منٹ، کیوٹو پینتالیس منٹ وغیرہ وغیرہ۔

اوساکا میں ایک سٹیشن پر گاڑی رکنے کی مدت ایک منٹ تھی۔ وہاں سے سکول کی لڑکیاں سوار ہوتی تھیں اور ان کی گپ شپ میں بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ دروازہ بند ہونے میں زیادہ وقت لگ جاتا۔ اس روٹ پر سفر کرنے والے لوگوں نے باقاعدہ درخواست دی کہ یا تو اس بات کا اعلان کیا

جائے کہ اس سٹیشن پر دو منٹ کا سٹاپ ہے یا دروازے ہر حالت میں ایک منٹ بعد بند کر دیے جائیں۔

ہمارے ہاں جو ہوتا ہے اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ کسی دعوت، شادی یا تقریب میں وقت پر پہنچنا کسرِ شان سمجھا جاتا ہے اور اس میں پڑھے لکھے بھی برابر کے قصوروار ہیں۔

اللہ کا فضل ہے کہ والدین کی تربیت کی وجہ سے میں شروع ہی سے وقت کا پابند ہوں۔ اس لئے مجھے جاپان میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اب بھی میں نے یہ عادت برقرار رکھی ہے۔ اس کے باوجود کہ جب میں کسی تقریب یا شادی میں پہنچتا ہوں تو یا تو خاکروب جھاڑو لگا رہے ہوتے ہیں یا ابھی شامیانے کھڑے کیے جا رہے ہوتے ہیں۔ لوگ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں مگر مجھے یہ تہمت قبول ہے۔

•••

جاپانیوں کی زندگی اتنی مصروف ہے کہ باقاعدہ نیند کم ہی ملتی ہے۔ اکثر جاپانی عموماً گیارہ بارہ بجے رات گھر پہنچتے ہیں اور صبح چھ سات بجے پھر گھر سے نکل پڑتے ہیں۔ انہیں دورانِ سفر نیند پوری کرنے کی کمال مہارت حاصل ہے۔ ٹرین میں ساٹھ ستر فیصد لوگ آپ کو خراٹے بھرتے نظر آئیں گے مگر مجال ہے کہ کبھی منزل سے آگے نکل گئے ہوں۔ جیسے ہی ان کی منزل کا نام پکارا جاتا ہے وہ نیند سے اس طرح بیدار ہوتے ہیں جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔

اس زمانے میں تو کتابیں پڑھنے کا رواج عام تھا۔ جو جاگ رہے ہوتے تھے ان کے ہاتھ میں کتاب ہوتی تھی۔ اب کتاب کی جگہ سمارٹ فون نے لے لی ہے۔

•••

ایک اور قابلِ ذکر بات جاپانیوں کی روایت پسندی اور میل جول میں تکلفات کی بھرمار ہے۔ مثلاً وہاں آداب کہنے کے لئے نہ تو ہاتھ ملایا جاتا ہے نہ ہاتھ جوڑے جاتے ہیں، بلکہ جسم کے اوپر والے حصے کو تقریباً نوے ڈگری کے زاویے تک جھکایا جاتا ہے۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ دونوں حضرات یا خواتین جھکے ہوئے ہیں اور کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں کہ پہلے دوسرا شخص سیدھا ہو تو وہ بھی سیدھے ہوں۔ جس طرح لکھنؤ کے نوابوں میں پہلے آپ والا معاملہ تھا بس وہی سمجھیے۔ مگر یہاں ٹرین چھوٹنے کی نوبت نہیں آتی البتہ کمر درد ضرور ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ امریکی اثرات کے باوجود لوگ اپنے لباس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ نوجوان لڑکے لڑکیوں کو چھوڑ کر ملازمت پیشہ یا کاروباری لوگ ہمیشہ معقول اور اعلیٰ معیار کا لباس پہنتے ہیں۔ اس معاملہ میں خواتین مردوں سے بھی بہتر ہیں۔

●●●

جاپانی نہ صرف اپنی روایات پر فخر کرتے ہیں، ان میں خودداری بھی بہت زیادہ ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے کچھ تاریخی نوعیت کی مثالیں پیش کرتا ہوں۔

سونی کے نام سے کون واقف نہیں۔ ۱۹۴۶ عیسوی میں جنگ میں شکست کے بعد سونی کے بانی مسارو ابا کو (Misaru Ibaku) کا امریکہ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں وہ کسی ریسٹورنٹ میں گیا اور فرمائش کی کہ اگر کوئی جاپانی ڈش ہے تو دے دی جائے۔ جو خاتون بیرا گیری کر رہی تھی، اس نے نفرت آمیز لہجے میں اس کے سامنے چاپ سٹک رکھ دیں اور کہا کہ ان کے پاس یہی جاپانی چیز تھی اور جاپانی اسے ہی بنا سکتے تھے۔

اس توہین کا اس نے اتنا اثر لیا کہ جاپان واپس آ کر سونی کی بنیاد رکھی اور ثابت کیا کہ جاپانی امریکنوں سے بہتر چیزیں بنا سکتے ہیں۔

اسی طرح کی کہانی نیشنل پیناسونک کی ہے مگر اس میں بین الاقوامی رنگ نہیں۔ اس کا بانی کون سوکے متسوشیتا (Konsuke Matsushita) ۱۹۱۸ عیسوی میں سوچ (switch) بنانے والی ایک کمپنی میں معمولی ملازم تھا۔ اس کے ذہن میں ایک نیا خیال آیا اور اس کے مطابق اس نے ایک نیا سوچ بنا ڈالا۔ وہ بڑے شوق سے اسے لے کر کمپنی کے مالک کے پاس گیا۔ بجائے اس کے کہ اسے شاباش ملتی، اسے زبردست ڈانٹ پلائی گئی۔ اس نے فوراً نوکری کو خیرباد کہا اور غصے کی حالت میں گھر پہنچا۔ اس نے اپنی بیوی سے پوچھا کہ گھر میں کتنی رقم ہے۔ جواب ملا کہ سو ین (آج کل اس رقم سے ایک کپ چائے بھی نہیں ملتا)۔ اس نے اسی سے کاروبار شروع کیا اور نتیجہ سب کے سامنے ہے۔

●●●

ہمارے ہاں اکثر دیکھا گیا ہے کہ نئی مشینری وغیرہ تو بڑے زور شور سے لگا دی جاتی ہے۔ افتتاح ہوتا ہے، خبریں بنتی ہیں اور پھر وہ قصہ پارینہ بن جاتی ہیں۔ یعنی maintenance صفر

ہے۔اس عادت کی وجہ سے ہم اربوں کھربوں کا نقصان اٹھاتے ہیں۔

جاپان میں maintenance پر بہت توجہ دی جاتی ہے۔میرے انسٹی ٹیوٹ میں نئی لفٹ لگی۔ایک ہفتہ بعد ہی نوٹس لگ گیا کہ چیکنگ کے لئے لفٹ دو گھنٹے بند رہے گی۔اور اس کے بعد لفٹ ہر ہفتے دو دو گھنٹے کے لئے بند کی جاتی۔ہماری سوچ کے مطابق تو ایک ہفتہ میں مشین کو کیا ہونا ہے۔سال دو سال بعد دیکھیں گے یا جب خراب ہوگی تو دیکھ لیں گے۔

اس باقاعدہ چیکنگ سے نہ جانے کتنی قیمتی جانیں بچتی ہیں اور ان مشینوں کی زندگی میں کتنا اضافہ ہوتا ہے۔

•••

۲

اب میں دوبارہ اپنی روداد کی طرف چلتا ہوں۔

چونکہ اب نسبتاً فراغت تھی اور میں تفریح کو اپنے پروگراموں میں شامل کر سکتا تھا، میں نے ہوسٹل کے نوٹس بورڈ پر نظر رکھنی شروع کر دی۔ جلد ہی مجھے اپنے مطلب کا نوٹس مل گیا۔

جس طرح کچھ عرصہ پہلے کاوانیشی والوں نے ہمیں مہمان بنایا تھا، اس دفعہ ابارا کی (Ibaraki) والوں نے دعوت دی ہوئی تھی۔ ابارا کی، اوساکا کے شمال مشرق میں چھوٹا سا نواحی علاقہ ہے۔ ابارا کی والے اپنا سالانہ تہوار منا رہے تھے۔ پروگرام کی خاص بات Japanese tea ceremony تھی۔ اس کے علاوہ کچھ اور تقریبات بھی تھیں۔

مقررہ دن ہم تقریباً نو بجے ابارا کی شہر کے مرکز (city center) میں پہنچے۔ وہاں ایک جشن کا سماں تھا۔ اس جگہ کے بیچوں بیچ ایک کلاک ٹاور تھا۔ جب ایک گھنٹہ پورا ہوتا تھا تو ایک پری نکلتی تھی۔ عین اسی وقت کئی پرندے بھی اپنے گھونسلوں کے پٹ کھول کر باہر آتے تھے اور چہچہاتے تھے۔ کلاک ٹاور کی بیرونی سطح سورج کی کرنوں کی وجہ سے مسلسل جگ مگ جگ مگ کرتی تھی۔

اس کلاک ٹاور کے اردگرد بیس پچیس سٹال لگے ہوئے تھے اور لوگ مختلف تفریحات میں مصروف تھے۔

ایک طرف ایک نوجوان سومو پہلوان جس کا کل پہناوا ایک لنگوٹی تھی، لکڑی کا ہتھوڑا چلا رہا تھا۔ ہم کچھ دوست اس طرف متوجہ ہوئے اور اس سے ملنے چلے گئے۔ وہ ایک بڑے لکڑی

کے برتن میں رکھے ابلے ہوئے لوبیے کا بھرتا بنا رہا تھا۔ کافی مار کٹائی کے بعد یہ لوبیا اس مقام تک پہنچتا ہے جہاں اسے توچی (tochi) کہا جاتا ہے۔ توچی زیادہ تر جاپانی مٹھائیوں کا بنیادی جز ہے۔ ہم نے بھی اپنی بساط کے مطابق اس کار خیر میں حصہ لیا۔ بعد میں اس کے کچھ حصے کو ہمارے شکم میں بھی جانا تھا۔

کچھ لوگ سومو پہلوان کے ساتھ شرارتیں کرنے لگے۔ وہ بھی تفریح کے موڈ میں تھا۔ ہمارے ایک بہت دبلے پتلے ساتھی نے اسے کشتی کا چیلنج کر دیا۔ پہلے تو وہ پہلوان جان بوجھ کر اپنے مقابل کے سامنے اناڑی بنا رہا۔ پھر اچانک اس نے ہمارے ساتھی کو دونوں ٹخنوں کے قریب سے پکڑا اور الٹا لٹکا دیا۔ یہ کام اس نے اتنی آسانی سے کیا جیسے کوئی رومال زمین سے اٹھا کر جھاڑنے لگا ہو۔ کیونکہ یہ سب ہنسی کھیل تھا، دو چار تصویریں بنوا کر اس نے ہمارے ساتھی کو سیدھا کر دیا۔ اس نے باقی لوگوں کو بھی زور آزمائی کی دعوت دی مگر سب بھاگ گئے۔

●●●

قریب ہی ایک مندر تھا جہاں بہت بھیڑ تھی۔ امتحان قریب تھے، اس لئے نوجوانوں، خاص طور پر لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ سب طالب علم اپنی مرادیں لکھ کر ایک دیوار پر لگی کھونٹیوں سے باندھ رہے تھے اور ہاتھ جوڑ کر اپنے دیوتاؤں کو راضی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

مگر ایک لڑکی سب سے الگ تھی اور صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کا مسئلہ کہیں زیادہ سنگین تھا۔ بہترین لباس (یونیفارم نہیں) میں ملبوس یہ بیس پچیس سالہ لڑکی تقریباً سو گز کے فاصلے پر قائم دو چھوٹے سے میناروں کے درمیان تیز قدموں سے پھیرے لے رہی تھی۔ سر جھکا ہوا تھا، آنکھیں اشکبار تھیں اور ہاتھ میں تسبیح نما کوئی چیز تھی۔ یا تو محبت کا معاملہ تھا یا کسی عزیز کی بیماری کا۔ یوں سمجھیے کہ وہ چلہ کاٹ رہی تھی۔ ہم دس پندرہ منٹ وہاں رہے مگر اس کی رفتار اور خشوع و خضوع میں کوئی کمی نہیں آئی۔ نہ جانے وہ کب سے اس عمل میں مصروف تھی اور بعد میں کب تک یہ عمل چلا۔

●●●

تقریباً بارہ بجے ہم نے چائے کی تقریب یعنی tea ceremony میں جانا تھا۔ یہ جاپانی روایت پسندی کی عمدہ مثال ہے۔ عام زندگی میں یہ چائے کوئی نہیں پیتا مگر اس صدیوں پرانی روایت کو نہ صرف زندہ رکھا گیا ہے، بلکہ اس کے لئے خاص عمارتیں بھی تعمیر کی جاتی ہیں۔ آداب

بہت پیچیدہ ہیں اس لئے میز بانوں کی خاص تربیت کی جاتی ہے۔

جاپانی میں اس تقریب کو چانویو (chanoyu) کہتے ہیں اور جو چائے استعمال ہوتی ہے وہ ماچا (macha) کہلاتی ہے۔ یہ پسی ہوئی سبز رنگ کی چائے ہوتی ہے۔ tea ceremony میں یا تو کوای چا (koicha) پیش کی جاتی ہے یا اوسوچا (usucha)۔ کوای چا، اوسوچا سے تین گنا گاڑھی ہوتی ہے۔

ہمیں ایک ٹی ہاؤس میں لے جایا گیا۔ دو خواتین روایتی جاپانی لباس کی مونو (kimono) میں ملبوس ہمارے استقبال کے لئے دروازے پر موجود تھیں۔ یہ لباس صدیوں سے ایسا ہی ہے۔ بال بھی قدیم انداز کے جوڑے کے انداز میں گندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے سر جھکا کر ہمارا استقبال کیا اور ایک کمرے میں لے گئیں جہاں ایک تاتامی بچھی ہوئی تھی اور درمیان میں تقریباً ایک فٹ اونچی میز تھی۔

ہم میز کے اردگرد بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد ایک میز بان آئی اور ہر مہمان کے سامنے ایک پیالہ رکھ دیا گیا۔ دوسرے برتن بھی سجا دیے گئے۔ ہر برتن کو ایک خاص انداز سے صاف کیا گیا۔

ہر مہمان کے سامنے پیالہ رکھنے کا مطلب تھا کہ ہمیں اوسوچا پلائی جانی تھی۔ یعنی یہ فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ ہم کوای چا کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ وہ تین گنا زیادہ تیز ہوتی ہے۔ نشانی یہ تھی کہ کوای چا کا ایک ہی پیالہ ہوتا ہے جس سے سب ایک ایک گھونٹ لیتے ہیں۔ اوسوچا کے لئے ہر مہمان کو علیحدہ پیالہ دیا جاتا ہے۔

میز بان نے ایک برتن میں سے بانس کے بنے چمچے کے ذریعے چائے کو نکالا اور ایک بڑی چائے دانی میں ڈال دیا جس میں گرم پانی تھا۔ اس کے بعد اس نے بانس ہی سے بنے ایک tea whisk سے چائے کو پھینٹنا شروع کر دیا۔ یہ tea whisk بہت نفاست سے بنا ہوا تھا اور بانس کی بہت باریک پھچیوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ اسے ایک دو دفعہ ہی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ہمیں کاناپوسی کے ذریعے بتایا گیا کہ جب میز بان چائے پیش کرے گی تو وہ سر کو جھکا کر اٹھائے گی۔ ہمیں بھی جواب میں ایسا ہی کرنا تھا۔

•••

چائے پیش کرنے کے بعد میز بان ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کا روز کا کام تھا۔ اسے

پتہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے، اس لئے وہ ہمیں دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

مگر ہمارے ساتھ جو ہونے والا تھا ہم اس سے بالکل بے خبر تھے۔

میں نے پیالہ منہ کو لگایا اور ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا۔ چھوٹا اس لئے کہ بڑا گھونٹ لینا آداب کے خلاف ہے۔ مگر یہ حقیقت فوراً ہی آشکارا ہوگئی کہ بڑا گھونٹ لیا ہی نہیں جا سکتا۔

اس چائے کا ذائقہ اتنا کڑوا تھا کہ جیسے منہ میں کونین ڈال دی گئی ہو۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ چینی سے بھی مبرا تھی۔ بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ چہرے پر آنے والے قدرتی تاثرات کو دبانا تھا اور یہ ظاہر کرنا تھا 'واہ کیا بات ہے۔' میری دائیں طرف ایک انگریز بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ضبط کا دامن چھوٹ چھوٹ جاتا تھا۔ اس کی حالت دیکھنے والی تھی۔

مگر ابھی پورا پیالہ باقی تھا۔ اسی کانا پھوسی کے ذریعے بتایا گیا کہ پورا پیالہ پینا ضروری نہیں۔ چلو جان چھوٹی۔ مگر دو تین گھونٹ تو پینے تھے۔

میں اس چائے کی برائی نہیں کر رہا۔ ویسے اتنی اچھی ہوتی تو جاپانی روزمرہ کے معمول میں اسے جگہ دیتے۔ بس یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح بلیک کافی کا ذائقہ پروان چڑھانا پڑتا ہے اور پھر اسے پیے بغیر زندگی نامکمل رہتی ہے، وہی معاملہ اس چائے کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔

اگر ہمیں کوای چا پلا دی جاتی جو تین گنا گاڑھی ہوتی ہے تو پتہ نہیں دل ناتواں پر کیا گزرتی۔

•••

جاپان میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے اور ان میں جاپانی نژاد مسلمان تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ مگر جو ہیں وہ سچے مسلمان ہیں اور تقریباً ہر شہر میں انہوں نے ایک اسلامک سوسائٹی بنا رکھی ہے جہاں دوسرے ممالک سے آئے ہوئے مسلمان اکٹھے ہوتے ہیں۔

ایسی ہی ایک اسلامک سوسائٹی اوساکا میں بھی تھی جس کی رُوحِ رواں ایک جاپانی خاتون تھیں جن کا اسلامی نام زیبا تھا۔ ہر مہینے دو مہینے بعد اس سوسائٹی کا اجلاس ہوتا تھا جس میں میں بھی شرکت کرتا تھا۔

اس خاتون نے پی آئی اے کے ایک پائلٹ سے شادی کی اور مسلمان ہوگئی۔ حقیقت جو بھی تھی مگر جو میں نے سنا وہ یہ تھا کہ وہ پائلٹ رنگین مزاج تھا اور یہ شادی اس نے اپنے جبلی تقاضے پورے کرنے کے لئے کی تھی۔ وہ پہلے سے شادی شدہ تھا مگر یہ بات چھپائی گئی تھی۔

کچھ ہی عرصہ بعد اس نے زیبا کو طلاق دے دی۔ مگر آفریں ہے کہ اس تلخ تجربہ کے باوجود اس نے اسلام سے اپنے تعلق کو مضبوط تر کیا اور ایک پکی مسلمان بن کر دوسروں کے لئے مثال بنی۔

زیبا کا دینی علم واجبی سا تھا مگر جذبہ بہت سچا تھا۔ اسلامک سوسائٹی کے تمام اخراجات جن میں اجلاس کے انتظامات بھی شامل تھے، وہ خود کرتی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ ہم لوگ جاتے ہوئے اپنی بساط کے مطابق کھانے پینے کی چیزیں لے جاتے تھے۔

ہر اجلاس میں مختلف موضوعات پر تقاریر ہوتی تھیں اور سوال و جواب ہوتے تھے۔ تیس پینتیس لوگ تو ہوتے ہی تھے۔ زیبا خود سوال پوچھنے والوں میں پیش پیش ہوتی۔ وہ دین کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتی تھی۔

مقررین میں عام طور پر تو مقامی مذہبی سکالر ہوتے جن میں عرب ممالک سے تعلق رکھنے والے نمایاں تھے۔ مگر بعض دفعہ بڑی جلیل القدر اور عالمی شہرت یافتہ شخصیات بھی شرکت کرتیں۔ یہ بھی زیبا کا کمال ہوتا۔

انہیں مجالس میں مجھے ڈاکٹر مورس بوخیل (Maurice Bucaille) سے ملاقات کا موقع ملا۔ یہ فرانسیسی ڈاکٹر تھے جو سعودی عرب کے شاہ فیصل اور مصری صدر انور سادات کے ذاتی معالج رہ چکے تھے۔ انہوں نے ایک تہلکہ انگیز کتاب 'بائبل' قران اور سائنس (Bible,Quran, and Science) کے عنوان سے لکھی جس میں انہوں نے سائنسی بنیادوں پر کہا کہ موجودہ بائبل کے مندرجات سائنسی پرکھ پر پورے نہیں اترتے جب کہ قران کی ہر چیز کو سائنس سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک اور کتاب انسان کی ابتدا (origin of man) کے عنوان سے لکھی۔

ان کتابوں نے انہیں دائمی شہرت بخشی اور ان کے نظریات کو Bucailleism کا نام دیا گیا۔ قدامت پسند عیسائیوں کا ناراض ہونا فطری تھا مگر اکثریت نے ان کتب کو بہت دلچسپی سے پڑھا۔ مسلمانوں کے تو وہ ہیرو بن گئے۔

اسی طرح ایک دفعہ فلسطین کے مفتی اعظم بھی تشریف لائے۔

•••

اسی نوعیت کے اجلاس کیوٹو اور کوبے میں بھی ہوتے تھے۔ ہم لوگ بھی وہاں چلے جاتے اور وہ لوگ بھی اوساکا آجاتے۔

کیوٹو میں ایک دفعہ بڑا دلچسپ واقعہ ہوا۔لوگ زیادہ ہو گئے اور ہال میں نماز پڑھنے کی جگہ کم پڑ گئی۔ فیصلہ ہوا کہ باہر گراؤنڈ میں نماز پڑھ لی جائے۔ جیسے ہی صف بندی ہوئی اور نماز شروع ہوئی، ہمیں پولیس نے گھیر لیا۔ کسی کارروائی سے پہلے انہوں نے نماز ختم ہونے کا انتظار کیا۔

نماز کے بعد انہیں ساری صورتِ حال سمجھائی گئی تو وہ واپس لوٹ گئے مگر اس تنبیہ کے بعد کہ اگر ہم نے آئندہ کھلی جگہ پر یہ کارروائی کرنی ہے تو پہلے اجازت لینی پڑے گی۔

دراصل اذان کا ہونا اور صف بندی دیکھ کر مقامی جاپانی گھبرا گئے تھے کہ ہم خطرناک لوگ تھے اور کوئی غلط حرکت ہونے والی تھی۔ اس لئے فوراً پولیس بلالی گئی۔ یاد رہے یہ آج سے اٹھائیس سال پرانی بات ہے جب دہشت گردی کا جن بوتل سے باہر نہیں آیا تھا۔

نماز کے دوران عربوں کا رویہ بھی بڑا 'کھلا ڈلا' ہوتا تھا۔قران شریف کی تعظیم وہ اس طرح نہیں کرتے جیسے ہم کرتے ہیں اور یہاں بھی وہ اکثر جوتے اتارے بغیر ہی نماز پڑھ لیتے تھے۔ انہیں کچھ کہنا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف تھا۔ وہ خود کو اسلام کا ٹھیکیدار سمجھتے تھے۔

●●●

۳

جب پروفیسر صاحب نے یہ دیکھا کہ میرا اسکولرشپ ختم ہونے میں ڈیڑھ سال رہ گیا تھا اور میرا مزید رکنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا تو انہوں نے ایک نیا انکشاف کیا۔ انکشاف کیا تھا میرا ہی قصور تھا۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا جو کہ نہیں تھا۔

پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے ایک شرط اور تھی۔ مجھے دو غیر ملکی زبانوں کا امتحان پاس کرنا تھا۔

وہ کہنے لگے:

'میں انگریزی کو تمہاری غیر ملکی زبان نہیں مانتا مگر یونیورسٹی والے مان جائیں گے۔ مسئلہ دوسری زبان کا ہے۔ تین میں سے ایک کا انتخاب کرو، جاپانی، فرانسیسی یا جرمن۔ تمہارا اسکولرشپ ختم ہونے تک تمہارے پاس تین موقعے ہیں۔ پہلی کوشش میں تو پاس ہونا ناممکن ہے مگر تجربہ حاصل ہو جائے گا۔ دوسری اور تیسری کوشش میں امکانات بتدریج بڑھتے جائیں گے۔'

تمام اساتذہ کا مشورہ تھا کہ میں فرانسیسی یا جرمن کا انتخاب کروں۔ اس لئے کہ ان زبانوں کی انگریزی سے کچھ نہ کچھ مماثلت تھی، کم از کم رسم الخط کی حد تک۔ کئی الفاظ بھی مشترک تھے اور حروف کی تعداد بھی جاپانی کی طرح ہزاروں میں نہیں، انگریزی جیسی ہی تھی۔

مگر میرے لئے یہ دونوں زبانیں اجنبی تھیں۔ جاپانی زبان کے معاملے میں کم از کم یہ تو تھا کہ گائی دائی میں چھ مہینے تک کچھ نہ کچھ تعلیم حاصل کی تھی۔ یہ الگ بات کہ کبھی توجہ نہیں دی تھی اور

یہ بھی حقیقت تھی کہ وہاں ۱۸۰۰ کانجی میں سے بمشکل ۵۰ کانجی پڑھائے جاتے تھے۔
اور کانجی ہی اصل مسئلہ تھا۔ اس کے اٹھارہ سو حروف زبانی لکھنے آنے چاہیے تھے۔ یہی نہیں، ہر حرف کا علیحدہ علیحدہ جاپانی اور چینی تلفظ تھا۔ دونوں کا یاد کرنا ضروری تھا۔ امتحان میں ایک انگریزی کا پیراگراف آنا تھا جسے جاپانی میں ترجمہ کر کے لکھنا تھا اور ایک جاپانی کا پیراگراف جس کا انگریزی میں ترجمہ کرنا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ سوالات مختلف الفاظ کی پہچان اور معانی کے متعلق ہونے تھے۔
انگریزی کے پیراگراف کو جاپانی میں لکھنا تو تقریباً ناممکن تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ باقی سوالات پر محنت کی جائے تو پچاس فیصد نمبر حاصل کئے جاسکتے تھے جو پاس ہونے کی ضرورت تھی۔
یہ حساب کتاب لگا کر میں نے اعلان کر دیا کہ میں جاپانی زبان کا امتحان دوں گا۔
سب میرے فیصلے پر حیران تھے۔ پروفیسر صاحب تو چپ رہے مگر باقی سب نے برملا کہا کہ میرا کوئی چانس نہیں۔ دل میں پروفیسر صاحب بھی یہی سوچ رہے تھے۔ میں نے حوصلہ نہ ہارا اور اپنے فیصلے پر قائم رہا۔
میں نے پروفیسر صاحب سے درخواست کی کہ مجھے امتحان سے پہلے پندرہ دن کی چھٹی دے دیں۔ چونکہ میرا ریسرچ کا کام بہت اچھا جا رہا تھا، انہوں نے خوش دلی سے اجازت دے دی۔
میں نے پندرہ دن کے لئے ہر ضرورت کی چیز خرید لی اور کمرے میں جمع کر لی۔ اپنے دوستوں کو بھی کہہ دیا کہ سمجھیں کہ میں وہاں تھا ہی نہیں۔ کھانا پکا کر فریزر بھر لیا۔
اس کے بعد کمرہ بند ہو کر میں نے وہ کام شروع کر دیا جو ساری زندگی نہیں کیا تھا اور جس سے مجھے شدید نفرت تھی۔ یعنی رٹا لگانا۔ میں نے کانجی کے الفاظ کو رٹا لگانا شروع کر دیا۔ صبح، شام، رات، بار بار لکھتا اور پرکھتا۔ اب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔
آخر کار جنوری ۱۹۹۰ عیسوی میں امتحان کی گھڑی آ گئی۔ امتحان امیدا کیمپس میں تھا۔ اجنبی جگہ، مگر اس سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ پرچہ ملا تو اندازہ ہوا کہ کچھ امید کی جاسکتی تھی۔
سب سے پہلے آسان سوال کئے۔ اب دو بڑے مرحلے تھے۔ جاپانی سے انگریزی

میں ترجمہ بھی توقع کے مطابق ہو گیا یعنی درمیانہ۔ مگر کامیابی کا انحصار سب سے مشکل حصے میں کچھ نہ کچھ نمبر حاصل کرنا تھا۔ یعنی انگریزی سے جاپانی میں ترجمہ کرنا۔ میں نے جو سمجھ میں آیا لکھ دیا مگر مجھے قطعی یقین نہیں تھا کہ جو لکھ رہا تھا وہ صحیح تھا۔۔ البتہ امید کی ایک کرن تھی کہ ممتحن کو کچھ سمجھ نہ آئے اور وہ پرچہ کے باقی حصہ کی کارکردگی دیکھ کر اندازہ لگا لے کہ میں نے ٹھیک ہی لکھا ہوگا۔

•••

جب میں امتحان دے کر باہر نکلا اور چند قدم ہی چلا تو محسوس ہوا کہ دماغ بالکل ہلکا پھلکا ہو گیا ہے۔ مجھے کوئی کانجی یاد نہیں آ رہی تھی۔ یہ ایک ناگوار بوجھ تھا جس سے میرے ذہن نے پہلی فرصت میں ہی چھٹکارا حاصل کر لیا۔ اگر مجھے اسی وقت دوبارہ پرچہ تھما دیا جاتا تو میری کارکردگی صفر ہوتی۔

امتحان کا نتیجہ جو بھی ہونا تھا، اس وقت میں خود کو دنیا کا سب سے مطمئن اور آسودہ شخص محسوس کر رہا تھا جیسے میں نے زندگی کا مقصد حاصل کر لیا ہو، کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہو۔ دراصل اس آسودگی کی وجہ اس شدید ذہنی دباؤ سے باہر نکلنا تھا جس کے زیر اثر میں پچھلے دو تین ہفتے سے تھا۔

اگلے دن ڈپارٹمنٹ میں گیا تو سب لوگ میرے منتظر تھے۔ میں نے نپے تلے انداز میں کہا کہ کوشش تو میں نے پوری کی تھی مگر کامیابی کے بارے میں زیادہ پر امید نہیں تھا۔ وہ تو پہلے ہی فیصلہ کر چکے تھے کہ یہ سعی لا حاصل تھی اس لئے سب اپنے تئیں نوشتہ دیوار پڑھ کر بیٹھ گئے۔

مگر میرے دل میں امید کا ایک موہوم سا دیا جل رہا تھا۔

•••

امتحان کا نتیجہ ڈاک کے ذریعے پروفیسر متسودا کے پاس آنا تھا اور اس کی کوئی مقرر تاریخ نہیں تھی۔ میں اپنے کام میں لگ گیا۔ زیادہ فکر اس لئے نہیں تھی کہ ابھی دو مواقع باقی تھے۔ میں نے اپنی پوری کوشش کر لی تھی۔ اب جو کرنا تھا اللہ کی ذات نے کرنا تھا۔

میں اور پروفیسر صاحب ڈپارٹمنٹ میں سب سے پہلے آتے تھے۔ بلکہ یوں کہیے کہ وہ پہلے نمبر پر اور میں دوسرے نمبر پر تھا۔

ایک دن میں ڈپارٹمنٹ پہنچا تو پروفیسر صاحب میرے منتظر تھے۔ بڑی سنجیدگی سے

کہنے لگے:

'میرے آفس میں آؤ'

میں چلا گیا۔ ان کے چہرے پر کوئی غیر معمولی تاثر نہیں تھا۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ وہ ایکٹنگ کر رہے تھے۔ انہوں نے کاغذ کا ایک ٹکڑا میرے سامنے رکھ دیا۔ یہ میرا نتیجہ تھا اور میں سو میں سے پچپن نمبر لے کر پاس ہو گیا تھا۔ جیسے ہی انہوں نے دیکھا کہ میں نے کاغذ پر نظر ڈال لی ہے انہوں نے زور سے نعرہ لگایا:

"well done"

اور اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ یہ آج تک نہیں ہوا تھا۔

یہ خبر ان کے لئے بالکل غیر متوقع تھی۔ وہ میری صلاحیتوں پر یقین تو رکھتے تھے مگر اس حد تک میری کامیابی کا انہیں بالکل یقین نہیں تھا۔

اب وہ ڈپارٹمنٹ کے دروازے میں کھڑے ہو گئے اور ہر آنے والے کو میرا رزلٹ کارڈ دکھانے لگے۔ سب لوگ حیران اور خوش تھے۔ پروفیسر صاحب نے اعلان کیا کہ ان کی طرف سے اس عظیم کامیابی کو احسن طریقے سے منایا جائے گا۔ چنانچہ دوپہر تک ہر قسم کا کام بند کر دیا گیا اور ایک پرتکلف پارٹی ہوئی۔

اس دوران پروفیسر صاحب مجھے کہنے لگے:

'بورڈ پر آؤ اور جاپانی میں لکھو کہ میں نے امتحان پاس کر لیا۔'

میں نے ایسا ہی کیا اور نیچے تاریخ بھی ڈال دی۔ یہ ۷ مارچ ۱۹۹۰ عیسوی کا دن تھا۔ پھر انہوں نے بورڈ کی ایک طرف مجھے کھڑا کیا اور دوسری طرف خود کھڑے ہو گئے اور ایک یادگاری تصویر کھنچوائی۔ یہ تصویر سرورق کی زینت ہے۔

اس کارنامے نے میری دھاک بٹھا دی۔ ریسرچ تو میری پہلے ہی بہت اچھی چل رہی تھی۔ یہ کٹھن مرحلہ بھی پہلی ہی کوشش میں طے ہو گیا۔ اب میں ذہنی طور پر آزاد تھا اور جاپان میں اپنے قیام سے لطف اندوز ہو سکتا تھا۔ اس دوران کچھ نئے دوست بھی مل گئے تھے۔ یعنی اب گائی دائی والے دنوں کو دہرایا جا سکتا تھا۔ سیر سپاٹا کیا جا سکتا تھا مگر اپنے خرچے پر، جاپانی حکومت کے نہیں۔

●●●

۴

پروفیسر متسوداکے ساتھ میرا تعلق استاد شاگرد کی نسبت سے آگے نکل گیا تھا، جس طرح والدین کو شرارتی اور تھوڑا سا بے ادب بچہ عموماً زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ میں ڈپارٹمنٹ کے باقی لوگوں سے مختلف تھا۔ وہ سب روایت میں بندھے ہوئے تھے۔ میں نے ان روایات سے روگرانی کی تھی مگر خود کو بہتر بھی ثابت کیا تھا۔

اس وقت پروفیسر صاحب کی عمر ۶۰ سال کے قریب تھی مگر فٹنس کمال کی تھی۔ ان کا گھر میرے ہوسٹل سے کچھ آگے تھا۔ اکثر جاپانیوں کی طرح وہ بھی یا تو پیدل چلتے تھے یا سائیکل پر یونی ورسٹی آتے تھے۔ اوساکا کا یہ حصہ پہاڑی ہے، اس لئے اتار چڑھاؤ کافی ہیں۔

میں بھی کئی دفعہ سائیکل استعمال کرتا تھا۔ جب ہم ایک ہی وقت ڈپارٹمنٹ سے نکلتے تو وہ مجھے چیلنج کرتے کہ چلو دوڑ لگائیں۔ میرے ہوسٹل تک دو تین کلومیٹر کا فاصلہ تھا۔ میری عمر چھتیس سال تھی۔ ہمارا مقابلہ برابر کا ہوتا۔ کبھی وہ جیت جاتے کبھی میں۔

اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی اپنے ذمہ لے لیا تھا کہ میرا جاپان کی خاص خاص باتوں سے تعارف کرائیں۔ ہم استاد شاگرد کے رشتے میں بھی منسلک تھے اور بے تکلف دوست بھی تھے۔ ہم ایک دوسرے کی رفاقت سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

ایک دن کہنے لگے: 'حق، تم نے نوہ (Noh) دیکھا ہے'

میں نے کہا: 'نہیں'

کہنے لگے: 'اس ہفتے کسی دن چلتے ہیں۔'
مجھے کیا عار ہو سکتا تھا۔

نوہ (Noh) یا نوگاکو (Nogaku) جاپانی کلاسیکل میوزیکل ڈرامہ ہے جس کی ابتدا چودہویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ روایتی طور پر ایک کھیل کے چھ حصے ہوتے تھے جن میں سے پانچ سنجیدہ اور ایک ہنسی مذاق پر مشتمل ہوتا تھا۔ آج کل اسے مختصر کر دیا گیا ہے اور تین حصے ہوتے ہیں، دو سنجیدہ اور ایک مزاحیہ۔

دکھایا یہ جاتا ہے کہ ایک ماورائی چیز یعنی روح یا بھوت نے انسانی شکل لے لی ہے اور وہ کوئی کہانی بیان کر رہی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ تمام کرداروں کے چہرے ماسکوں سے ڈھکے ہوتے ہیں۔ روشنیوں کے زاویے تبدیل کرنے سے تاثرات بدلتے ہیں اور اسی کے مطابق اداکار اپنے جسمانی اعضا کو حرکت دیتے ہیں۔

مرکزی کردار جسے شی تے (shite) کہتے ہیں انسانی اور ماورائی شکل اختیار کرتا ہے۔ ولن کے کردار کو واکی (waki) کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ مسخرے اور سازندے بھی لازمی جز ہوتے ہیں۔

●●●

ہم نوہ تھیٹر میں داخل ہونے لگے تو باہر نوٹس لگا تھا:
'تصویر لینا منع ہے۔'
پروفیسر صاحب کو پتہ تھا کہ مجھے یہ نوٹس پسند نہیں آیا۔
انہوں نے شرارتی انداز سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگے:
'تم ہمیشہ ایک تصویر تو لے ہی سکتے ہو۔'
مطلب یہ تھا کہ ایک تصویر کھینچ لو گے تو کوئی منع کرے گا۔

جاپان میں یہ تو ہوتا نہیں کہ کیمرہ چھین کر تصویر ضائع کر دیں۔ دراصل یہاں تصویر کی ممانعت اس لئے تھی کہ فلیش چلنے سے اداکاروں کی یکسوئی متاثر ہوتی تھی۔ یعنی فلیش چلائے بغیر تصویر کھینچی جا سکتی تھی مگر اس نیم تاریک ہال میں اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

ہم ہال میں داخل ہوئے تو رنگ کی طرح درمیان میں سٹیج تھا اور چاروں طرف لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ رنگ میں تو رسیوں کی رکاوٹ ہوتی ہے، یہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔ اداکار لوگوں

کے بیچ میں سے گزر کر سٹیج پر جاتے تھے اور اداکاری کرتے تھے۔

یہ کھیل ایک بڑے ہال میں ہو رہا تھا جس کے اوپر چھت تھی مگر سٹیج کے اوپر بھی ایک ڈھلوانوں والی چھت تھی جو کنارے پر بنے چار ستونوں پر کھڑی تھی۔ یہ نوہ روایت کا حصہ ہے اور اس چھت کو مقدس سمجھا جاتا ہے۔

پروفیسر صاحب نے سٹیج کے سامنے والی یعنی سب سے مہنگی ٹکٹیں خریدی ہوئی تھیں۔ مجھے ہال میں داخل ہوتے ہوئے کہنے لگے:

'بولنا بالکل نہیں۔ اداکاروں کی توجہ بٹ جائے گی۔'

اور واقعتاً ایسا ہی تھا۔ ہال میں مکمل خاموشی تھی۔ یعنی pin drop silence۔

مگر اس کو کیا کہا جائے کہ خود موصوف سارا وقت کمنٹری کرتے رہے۔ نیت نیک تھی کہ مجھے سمجھ آ جائے مگر لوگ مڑ مڑ کر ہمیں دیکھ رہے تھے۔

ایک طلسماتی ماحول تھا۔ لگتا تھا کہ ہم کسی اور سیارے پر پہنچ گئے تھے۔ ماسک پہنے ہوئے کردار، قدیم لباس جن کے اندر خود کئی معنی پنہاں تھے، اور سازوں کے زیر و بم پر کرداروں کی slow motion میں حرکت اور اوپیرا کے انداز میں مکالمے۔ مجھے سمجھ نہ آنے کے باوجود یہ سب کچھ بہت دلچسپ لگ رہا تھا۔ اور جنہیں سمجھ آ رہی تھی وہ تو مبہوت تھے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مجال ہے کسی شخص کی نگاہ کسی اور طرف ہو۔ سوائے میرے اور پروفیسر صاحب کے۔

نوہ کے اداکاروں کے لباس بے حد شوخ رنگ تھے جن پر سنہری کام ہوا ہوا تھا۔ ماسک کے علاوہ انہوں نے کرداروں کی مناسبت سے مختلف انداز کی ٹوپیاں بھی پہنی ہوئی تھیں۔

ایک گھنٹہ بعد شو ختم ہوا۔ وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔

•••

اسی طرح پروفیسر صاحب ایک دن مجھے کابوکی (Kabuki) دکھانے لے گئے۔

کابوکی کی ابتدا ۱۶۰۳ عیسوی میں ہوئی یعنی نوہ سے تقریباً دو سو سال بعد۔ اس کا کینوس بہت وسیع ہے، اس لئے اسے نوہ سے بھی زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔ اس میں نوہ کی طرح صرف چار پانچ سو سال پرانے روحوں اور بھوتوں کے قصوں کو ہی نہیں، زندگی کے کسی بھی پہلو کو موضوع بنایا جا سکتا ہے۔

دونوں میں کئی اور بنیادی فرق ہیں۔ نوہ میں موسیقی کو زیادہ اہمیت حاصل ہے تو یہاں رقص کو۔ نوہ میں کردار ماسک پہنتے ہیں تو یہاں چہروں کو رنگوں سے سجایا جاتا ہے۔ اسی طرح نوہ کا سٹیج درمیان میں ہوتا ہے مگر کابوکی کا ایک طرف جیسے ایک سینما ہال ہو۔

شروع میں مردانہ اور زنانہ، دونوں قسم کے کردار عورتیں ہی کرتی تھیں۔ مگر پچیس سال بعد ہی عورتوں پر مکمل پابندی لگا دی گئی۔ اس کی وجہ فحاشی کا پھیلنا تھا۔ عورتوں کی جگہ نوجوان لڑکوں نے لے لی مگر یہاں بھی وہی مسئلہ آڑے آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چالیس پچاس سال میں ہی تمام کردار مردوں کے ذمے لگا دیے گئے اور یہ سلسلہ اب تک چل رہا ہے۔

زمانہ قدیم میں کابوکی تھیٹروں کے آس پاس کی گلیوں میں چائے خانے اور ریسٹورنٹ ہوتے تھے۔ آہستہ آہستہ تجارت بھی شروع ہوگئی۔ اور اس طرح کابوکی تھیٹر جاپانی تمدن کا ایک نمایاں حصہ بن گئے۔

●●●

کابوکی تھیٹر میں داخل ہوتے وقت ہم انہی مراحل سے گزرے۔ یعنی تصویر لینے کی ممانعت مگر پروفیسر صاحب کی ایک تصویر کے بارے میں یاددہانی۔ اور اسی طرح لوگوں کی محویت قابل دید تھی۔

مگر یہ ہال بہت بڑا تھا اور سٹیج بھی بہت وسیع تھا۔ سٹیج سے ہال کے ایک دروازے تک ایک لمبی راہداری بنی ہوئی تھی جس کے دونوں طرف لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس دروازے کے پیچھے میک اپ روم تھا اور اداکار اس راہداری سے گزر کر سٹیج تک آتے جاتے تھے۔

ان اداکاروں کے لباس نوہ کے کرداروں کی طرح ہی تھے۔ چہرے پر سفید رنگ (جو چاول سے بنتا ہے) کی لیپ تھی اور اس کے اوپر کردار کی مناسبت سے میک اپ کیا ہوا تھا۔ لباس کی شوخ رنگی ظاہر کرتی تھی کہ کردار یا تو مسخرہ ہے یا بے وقوف۔ سنجیدہ کرداروں کے لباس بھی سنجیدہ رنگوں میں تھے۔

سب سے حیران کن چیز سٹیج تھی۔ ہمارے ہاں تو تھیٹر میں عموماً پردے ہٹا کر پس منظر بدلا جاتا ہے، مگر کابوکی سٹیج پر پورے کا پورا منظر کرداروں سمیت سٹیج سے اٹھا لیا جاتا ہے اور اسی طرح اگلا منظر 'آسمان' سے کرداروں سمیت وارد ہوتا ہے۔ میں نے حیرت کا اظہار کیا تو پروفیسر صاحب

نے بتایا کہ یہ طریقہ تو تین سو سال پرانا ہے۔ اس زمانے میں تو رسے ہی استعمال ہوتے ہوں گے۔

تماشائیوں کا انہماک تو نوہ جیسا ہی تھا مگر ماحول پر تقدس اس حد تک نہیں چھایا ہوا تھا۔ اس کی وجہ کرداروں کی رقص سے مشابہ حرکتیں تھیں جن سے تفریح کا پہلو نمایاں ہوتا تھا۔ بولنے کا انداز نوہ کی طرح میکانکی ہی تھا مگر لے نسبتاً تیز تھی۔

یہاں بھی پروفیسر صاحب کی کمنٹری چلتی رہی جو بہت سودمند تھی۔ وجہ وہی تھی کہ نوہ کے کرداروں کی طرح یہاں بھی قدیم جاپانی بولی جارہی تھی جس سے میں مکمل طور پر ناآشنا تھا۔

●●●

آپ نے دیکھا کہ دنیا کی جدید ترین قوم ہوتے ہوئے بھی جاپانیوں نے کس طرح اپنی روایات، اپنے ماضی کو گلے لگایا ہوا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ عملی طور پر ان ادوار میں جا کر اپنا کچھ وقت گزارتے ہیں۔

جاپانیوں کا اپنی روایات سے یہ لگاؤ صرف سومو پہلوانی، نوہ اور کابوکی تک محدود نہیں، ہر شہر کے اپنے تہوار ہیں جنہیں وہاں کے مقیم دل و جاں سے مناتے ہیں۔

جاپان کے تمام تہواروں کا ذکر تو ممکن نہیں۔ اگر کیلنڈر لے کر بیٹھیں تو شاید روز ایک تہوار ہوتا ہو۔ میں یہاں اوساکا کے خاص تہواروں کا کچھ ذکر کرتا ہوں۔

ان میں تین جن (Tenjin) کا تہوار جاپان کے تین بڑے تہواروں میں گنا جاتا ہے۔ دوسرے دوٹوکیو کا کاندہ(Kanda)اور کیوٹو کا گیون(Gion) تہوار ہیں۔

تین جن تہوار کا مرکز تین مانگو(Tenmango) مندر ہے۔ یہ ہر سال جولائی کی چوبیس اور پچیس تاریخ کو منایا جاتا ہے اور کم وبیش تیرہ لاکھ لوگ اسے دیکھتے ہیں۔ اس کی تاریخ ایک ہزار سال پرانی ہے۔

پچیس جولائی کو پہلے تو ایک جلوس نکلتا ہے جس میں قدیم لباس میں ملبوس لوگ مختلف قسم کی رسومات انجام دیتے ہیں۔ اس کے بعد روحوں کو کشتیوں میں سوار کرنے کے بعد دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ بڑے بڑے فلوٹ ہوتے ہیں جن پر مختلف دیوتاؤں کی مورتیاں ہوتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم دیوتا اوجی گامی(Ojigami) ہے۔ جوں جوں اس کا بت دریا میں حرکت کرتا ہے، ڈھول کی آواز تیز تر ہوتی جاتی ہے۔

انداز اً سوفلوٹ ہوتے ہیں جو اوگاوا (Ogawa) دریا پر چلتے ہیں۔ جب یہ منزل مقصود تک پہنچنے والے ہوتے ہیں تو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کئی اقسام کے پانچ ہزار آتشیں گولے فضا میں چھوڑے جاتے ہیں۔ آسمان پر ان کا نظارہ اور دریا کے پانی میں لہراتا عکس ایسا منظر پیش کرتا ہے جس کا احاطہ الفاظ میں ناممکن ہے۔ ساتھ میں موسیقی کے مختلف انداز ایک بالکل جداگانہ ماحول بنا دیتے ہیں جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے اور یہ یادداشت کا ایک انمٹ حصہ بن جاتا ہے۔

دوسرا اہم تہوار سومی یوشی (Sumiyoshi) ہے جو تیس جولائی سے یکم اگست تک منایا جاتا ہے۔ پہلے دو دنوں میں تو پورے علاقے کو بدروحوں سے پاک کرنے کے لئے مختلف رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ یکم اگست کو ایک پریڈ ہوتی ہے جس میں مختلف مندروں کے ماڈل شامل ہوتے ہیں۔ ساتھ ساتھ عورتیں اور بچے موراماچی (Muramachi) دور کا لباس پہنے ہوئے جاپان کا سب سے قدیم دعائیہ گیت گاتے جاتے ہیں۔ اس دوران انہیں ایک خاص گھاس سے بنے ہوئے رنگ سے بار بار گزرنا پڑتا ہے۔ عام لوگ بھی اس پریڈ میں شامل ہو سکتے ہیں۔

ایک اور اہم تہوار گنگارا (Gangara) ہے جو اوساکا کے اکیڈا' (Ikeda) علاقے میں چوبیس اگست کو منایا جاتا ہے۔ اس کا مقصد آنے والے سال میں شیطان اور آگ سے محفوظ رہنا ہے۔ ایک مقدس شعلہ جلایا جاتا ہے جس سے سات سوکی (Satsuki) پہاڑ پر دو الفاظ لکھے جاتے ہیں 'بہت بڑا' اور 'بڑا'۔ اس کے بعد بارہ فٹ لمبی اور سو کلوگرام وزنی چھ مشعلیں جلائی جاتی ہیں اور عقیدت مند انہیں لے کر پورے علاقے میں گھومتے ہیں۔ یہ منظر قابل دید ہوتا ہے مگر اسے ذرا فاصلے سے دیکھنا ہی بہتر ہے۔

●●●

جاپانی فطرت سے بھی بہت قربت رکھتے ہیں۔ ان کے ناموں کے معانی میں اکثر پہاڑ، بادل، کھیت، دریا وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ اس تعلق کی ایک بہترین مثال پورا چاند دیکھنے کی تقریبات ہیں۔ انہیں تسوکی می (Tsukimi) کہا جاتا ہے۔ خزاں کے چاند کو، جو جاپانی کیلنڈر کے مطابق آٹھویں مہینے کے پندرہویں دن نمودار ہوتا ہے، خصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔ عموماً یہ دن ستمبر یا اکتوبر میں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ زمین، سورج، اور چاند کی تقابلی جگہ ایسی ہوتی ہے کہ چاند کی چمک زیادہ ہو جاتی ہے۔ ان تقریبات کا آغاز صدیوں پہلے ہی آن (Heian) دور میں ہوا۔

مجھے بھی ان تقریبات میں شامل ہونے کا موقع ملا۔

ایک دن ہوسٹل کے نوٹس بورڈ پر اکینو (Ikeno) قصبے میں ان تقریبات میں شرکت کی دعوت دیکھی ۔دو دن کا پروگرام تھا۔

ہم دو پہر کے وقت روانہ ہوئے اور ڈیڑھ گھنٹے میں منزل مقصود پر پہنچ گئے ۔کیا شاندار جگہ تھی ۔ایک بہترین ہوٹل تھا جس کے چاروں طرف پہاڑوں کی کئی قطاریں تھیں۔ہوٹل کے ایک طرف جنگل تھا اور دوسری طرف جھیل اور گالف کورس۔ہوٹل کا معیار کم از کم فور سٹار تھا۔

ہمیں کہا گیا کہ دو تین گھنٹے آرام کر لیں۔مغرب کے بعد ڈنر شروع ہوا۔ پتہ چلا کہ ہمارے علاوہ کئی اور مہمان بھی تھے۔ان میں ایک پاکستانی انجینئر امجد بھی تھے۔ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد جاپانی ڈرم پارٹی آ گئی اور کافی دیر تک ڈرم بجاتی رہی۔ پھر رقاصاؤں نے روائتی اودوری (Odori) رقص پیش کیا۔اس کے بعد کھلے لان میں محفل جم گئی۔وہاں پر اس موقعہ کی مناسبت سے جاپانی گھاس سوسوکی (susuki) سے کچھ آرائشی چیزیں بنائی گئی تھیں جن کی مجھے سمجھ نہ آسکی۔

سامنے چاند پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ ہلکی پھلکی گفتگو کی تو اجازت تھی مگر آداب کے مطابق اونچی بات چیت نہیں کرنی چاہئے تا کہ دوسروں کی محویت میں فرق نہ پڑے۔

میں نے بھی محو ہونے کی کوشش کی۔زندگی میں پہلی دفعہ اتنی فرصت ملی تھی کہ چاند کی چرخہ کاتنے والی بڑھیا کی جاسوسی کی جائے۔مگر کامیابی نہیں ہوئی۔کئی رخ سے چاند کے دھبوں کو ملا کر دیکھا مگر بڑھیا کا ہیولا نہ ابھر سکا۔

میں اس مشق میں مگن تھا کہ ایک پلیٹ میں کچھ کھانے کو پیش کیا گیا۔اس میں چاول اور شکر قندی نمایاں تھے۔ بتایا گیا کہ یہ ڈش چودھویں کے چاند کو دیکھتے ہوئے کھائی جاتی ہے۔ شکر قندی اس موسم کی خاص پیداوار ہے۔تقریباً آدھ گھنٹے بعد ایک صاحب نے ایک جاپانی نظم پڑھی جس میں چودھویں کے چاند کی خوبصورتی کو موضوع بنایا گیا تھا۔

اس قسم کی تقریبات ایک مہینہ بعد پندرھویں کے چاند کو دیکھنے کے لئے بھی منعقد کی جاتی ہیں ۔اگلے دن ہم دیر تک سوتے رہے۔واپسی کا سفر دو پہر کے بعد تھا۔ کچھ وقت گالف کھیل کر گزارا اور کچھ وقت امجد کے ساتھ جنگل کی سیر کی۔

●●●

۵

پروفیسر متسودا کی حس مزاح زبردست تھی۔ ایک دن میں ڈپارٹمنٹ پہنچا تو دیکھا کہ ہر طرف پانی ہی پانی ہے اور پروفیسر صاحب پائنچے اوپر کیے وائپر سے پانی نکالنے میں مصروف ہیں۔

میں نے پوچھا کہ کیا ہوا۔ انہوں نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا:

'Today Mr Maa has washed the laboratory with distilled water'

قصہ یہ تھا کہ محترم ما صاحب پچھلی شام سب سے آخر میں لیبارٹری سے گئے تھے اور ڈسٹلڈ واٹر پلانٹ کی ٹوٹی کھلی چھوڑ گئے تھے۔

اسی طرح ایک دن انڈونیشی خاتون کلارانتی (Claranti) صبح اپنے ڈیسک پر پہنچی تو ایک کاغذ پر لکھا رکھا تھا 'Clear Aunti'۔

وہ خاتون اکثر جاتے ہوئے اپنی چیزیں بکھری ہوئی چھوڑ جاتی تھی۔ یہ چیز پروفیسر صاحب کو ناپسند تھی۔ ہوسکتا ہے کہ ایک دودفعہ زبانی بھی تنبیہ کی ہو، مگر جب دیکھا کہ بات نہیں بن رہی تو انہوں نے یہ طریقہ اپنایا۔

دیکھئے کس خوبصورتی سے انہوں نے اس خاتون کے نام کو استعمال کرتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں اپنا پیغام پہنچا دیا۔ وہ ہنستے ہوئے میرے پاس آئی اور پوری روداد سنائی۔ اس دن کے بعد اس کے ڈیسک پر کبھی بے ترتیبی نظر نہیں آئی۔

پروفیسر صاحب کی اور نمایاں خصوصیت ان کی زندہ دلی تھی۔

ایک دن میں کافی پینے گیا تو پروفیسر صاحب کے سامنے فارموں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ وہ JICA (Japanese International Cooperation Agency) کی سلیکشن کمیٹی کے چیئرمین تھے اور چھوٹے کورسز کے لئے آنے والی درخواستوں کو دیکھ رہے تھے۔

اچانک بولے:

'حق ذرا ادھر آؤ۔'

میں گیا تو میرے سامنے ایک فارم رکھ دیا۔ اس پر ایک بہت خوبصورت لڑکی کی تصویر تھی جس کا تعلق برازیل سے تھا۔

کہنے لگے:

'کیا یہ لڑکی خوبصورت نہیں؟'

اختلاف رائے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

مجھے کہنا پڑا:

'یقیناً بہت خوبصورت ہے۔'

یہ سنتے ہی ان کا چہرہ کھل اٹھا، آنکھ ماری اور بولے:

'او کے'

اور ساتھ ہی فارم پر selected کی مہر لگا دی۔

وہ خاتون میرے پاکستان آنے کے بعد ڈپارٹمنٹ آئی اور دس مہینے کام کیا۔

●●●

مجھے بچپن سے ایک چھوٹا سا مسئلہ تھا۔ پیشاب کی حاجت تو محسوس ہوتی تھی مگر فراغت میں کافی دیر لگتی تھی۔ گردوں کے ایکسرے صاف تھے اس لئے بتایا گیا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔

پروفیسر صاحب کے ساتھ گھومتے پھرتے ہوئے جب ایک دو بار ایسا ہوا اور انہیں بہت دیر تک انتظار کرنا پڑا تو کہنے لگے کہ اس مسئلے کی تشخیص ہونی چاہیے اور حل نکلنا چاہیے۔

اگرچہ سارا خرچہ جاپانی گورنمنٹ نے کرنا تھا مگر پروفیسر صاحب نے پتہ نہیں کہاں کہاں رابطے کئے۔ فوری طور پر ملاقات کے وقت طے کئے اور سب کام چھوڑ کر میرے ساتھ ہو لئے۔ اس سارے عمل میں تین دن لگے۔ وہ مجھے اس طرح لے کر پھرتے رہے جیسے کوئی مشفق

باپ اپنے بچے کو لے کر پھرتا ہو۔

اس ساری محنت کا نتیجہ نکل آیا۔ تشخیص بھی ہو گئی اور علاج بھی ہو گیا۔ پاکستان میں کئی لوگوں کو جانتا ہوں جنہیں یہ مسئلہ ہے مگر وہ اس کے ساتھ جی رہے ہیں۔

ان تین چار دنوں میں کئی چیزوں کا مشاہدہ ہوا۔ جاپان میں جتنی عزت یونیورسٹی پروفیسر کی ہے، کسی اور کی نہیں۔ جہاں لوگوں کو پتہ چلتا تھا 'sensie, sensei' کہتے سر جھکا کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ sensei کا مطلب ہے استاد محترم۔

یعنی کھل جا سم سم والا معاملہ تھا۔ جو کام گھنٹوں میں ہونے ہوتے منٹوں میں ہو جاتے اور الٹا کام کرنے والے شکریہ ادا کرتے کہ انہیں خدمت کا موقع ملا۔

●●●

جاپان میں بیوروکریٹ بننے کا خواہش مند شاید ہی کوئی طالب علم نظر آئے۔ ترجیحات میں سول سروس کا نمبر پانچواں چھٹا ہے۔ جب کہ ہمارے ہاں ہر کوئی اس کے خواب دیکھتا ہے۔

اس کی وجہ کیا ہے؟ جاپان میں سول سرونٹ واقعتاً سول سرونٹ ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے دفتر اور عام لوگوں کی طرح گھر۔ اختیارات محدود ہوتے ہیں اس لئے فرعونیت کی کوئی گنجائش نہیں۔

ہم انگریز کی وراثت کو لے کر چل رہے ہیں۔ انگریز کی تو مجبوری تھی۔ وہ حاکم تھا اور اس نے کم و بیش ایک ہزار بیوروکریٹس سے ہندوستان جیسے وسیع ملک پر حکمرانی کرنی تھی۔ یعنی حاکم و محکوم کا رشتہ تھا۔ سول سروس، سول سرونٹ جیسے نام تو انگلستان سے آ گئے مگر درحقیقت ہر بیوروکریٹ کو اپنے علاقے کا حاکم ظاہر کرنا ضروری تھا۔ ہندوستانی بھی ڈنڈے کی زبان ہی سمجھتے تھے۔ قصور ان کا نہیں تھا۔ راجوں مہاراجوں نے ان سے اسی طرح برتاؤ کیا تھا۔ مختصر یہ کہ انگریزی حکومت کے لئے یہ ضروری تھا کہ اس کا ہر افسر اس علاقے کا راجہ مہاراجہ نظر آئے۔ اسی لئے انہیں وسیع بنگلے، دفتر، عملہ اور اختیارات دیے گئے۔

انگریز چلا گیا تو حاکم محکوم کا رشتہ بھی ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔ ہمارے صاحب اختیار 'کالے انگریز' بن گئے۔ انہوں نے اپنے اختیارات میں کمی کی بجائے اضافہ کر دیا۔ یعنی اپنی ہی قوم کو محکوم بنالیا اور خود حاکم بن گئے۔ کئی لحاظ سے وہ انگریز سے بھی بدتر ثابت

ہوئے۔ انگریز نے جیسے بھی قوانین بنائے وہ سب کے لئے ایک تھے، مساوات تھی اور ان قوانین پر عمل ہوتا تھا۔ کالے انگریزوں نے مساوات کی دھجیاں اڑا دیں اور ایک استحصالی مافیا نے جنم لیا جو اب تک سرطان کی طرح وطنِ عزیز کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔

تمام سول سرونٹ ایسے نہیں رہے نہ اب ہیں۔ بے شمار روشن مثالیں بھی موجود ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اکثریت کا تعلق 'کالا انگریز' گروپ سے ہے۔ جب تک ترازو کا پلڑہ دوسری طرف نہیں جھکے گا ہم حقیقی ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتے۔

•••

اب واپس پروفیسر متسودا کی طرف آتے ہیں۔ ان تین چار دنوں میں یہ حیرت انگیز انکشاف بھی ہوا کہ وہاں کوئی پرائیویٹ ڈاکٹر اپنی مرضی سے فیس نہیں لے سکتا۔ حکومت نے فیسیں مقرر کی ہوئی ہیں۔ مزید حیران کن بات یہ کہ چاہے عام ڈاکٹر ہو یا سپیشلسٹ، مشورہ کی فیس ایک ہی ہے۔

میں نے پروفیسر صاحب سے پوچھا:

'پھر لوگوں کو اتنا پڑھنے کا کیا فائدہ؟'

انہوں نے جواب دیا:

'عام پبلک پڑھی لکھی ہے اور خوب سمجھتی ہے کہ کس کے پاس جانا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ سپیشلسٹ کے پاس ہی جائے گی۔'

ہمارے ہاں جو اندھیر نگری ہے، اس پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

•••

پروفیسر متسودا کا ذکر تو بہت ہو گیا۔ یہ ناانصافی ہوگی اگر میں پروفیسر سوگی موتو کے بارے میں بات نہ کروں۔ ان کے مجھ پر اتنے ہی احسانات ہیں جتنے پروفیسر متسودا کے ہیں۔

مائیکروبیالوجی یعنی خورد حیاتیات کے بانیوں میں دو بڑے نام ہیں۔ ایک لوئی پاسچر (Louis Pasteur) اور دوسرا رابرٹ کاک (Robert Koch)۔ پاسچر جسے فادر آف مائیکروبیالوجی بھی کہا جاتا ہے، نتیجہ پر پہلے پہنچتا تھا اور پھر اسے ثابت کرنے کے لئے تجربات کرتا تھا۔ رابرٹ کاک قدم بہ قدم چلتا تھا اور اپنے تجربات کے نتائج کے مطابق نتیجہ اخذ کرتا تھا۔ اس طریقہ میں دیر

تو لگ سکتی ہے مگر بڑی ناکامی کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ ہر مرحلے کے بعد نتائج کا جائزہ لینے سے بڑی غلطیوں کی راہ بند ہو جاتی ہے۔ جبکہ پاسچر والے انداز سے آپ کوئی بہت بڑی کامیابی اچانک حاصل کر سکتے ہیں مگر اس کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مالی بے فکری بھی ضروری ہے۔

اگر پروفیسر متسوداکولوئی پاسچر سے تشبیہ دی جائے اور پروفیسر سوگی موتو کو رابرٹ کاک سے تو غلط نہ ہوگا۔ اسی وجہ سے ان میں سائنسی اختلاف رہتا تھا۔

میرا اپنا کام کرنے کا انداز پروفیسر سوگی موتو کے انداز سے ملتا جلتا تھا۔ اسی وجہ سے ہمارے درمیان بہت اچھا سائنسی رشتہ تھا۔ ایک اور بات بھی تھی۔ وہ عمر میں مجھ سے صرف تین چار سال بڑے تھے۔ اس وجہ سے کئی موضوعات پر بے تکان گفتگو ہو سکتی تھی۔ ان موضوعات میں کرکٹ سے لے کر مذہب تک سب کچھ شامل ہوتا تھا۔ وہ صاف گو تھے اور بات گھما پھرا کر کرنے کے عادی نہیں تھے۔ اس وجہ سے بھی کئی معاملات ابتدا میں ہی سدھر جاتے تھے۔

وہ خود تو دیگر جاپانی سائنسدانوں کی اکثریت کی طرح لا مذہب تھے مگر جاننے کی تمنا ضرور رکھتے تھے۔

ایک دن مجھ سے کہنے لگے:

'مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں مان لوں کہ خدا کا وجود ہے اور مجھے کوئی الہامی مذہب اختیار کرنا ہے تو میں اسلام کو عیسائیت یا یہودیت پر کیوں ترجیح دوں؟'

میں نے جواب دیا:

'ایسی صورت میں آپ چاہیں گے کہ خدا کا پیغام آپ تک براہِ راست پہنچے تاکہ کسی غلطی کا اِمکان نہ رہے۔'

وہ بولے:

'بالکل'

میں نے کہا:

'پھر تو فیصلہ آسان ہے۔ اسلام میں ہمارے پاس اللہ کا کلام قران شریف کی صورت میں موجود ہے اور غیر مسلموں سمیت سب مانتے ہیں کہ شروع سے اس میں ایک نکتے کی بھی کمی بیشی

نہیں ہوئی۔اس کے برعکس تورات اور انجیل اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں اور گزرتے وقت کے ساتھ ان میں بہت تبدیلی آ چکی ہے۔اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ تبدیلیاں انسان لائے ہیں۔اب آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ آپ کس پر اعتبار کریں گے۔قرآن پر یا بائبل اور تورات پر۔'

وہ سوچ میں پڑ گئے اور کہنے لگے:

'بات تو تمہاری بالکل ٹھیک ہے۔'

میں نے سلسلہ کلام جاری رکھا:

'اگر تورات اور بائبل کو اصل حالت میں رکھا جاتا اور ان پر اسی طرح عمل ہوتا تو وہی اسلام تھا۔یعنی اللہ کا دین۔جو حضرت ابراہیم کے زمانے سے اسلام ہی ہے۔ایسی صورت میں قرآن صرف دین کی تکمیل کے لئے نازل ہوتا۔'

اسی طرح انہیں کرکٹ سے بھی دلچسپی پیدا ہوگئی۔وہ بیس بال اور کرکٹ کا مقابلہ کرتے اور مزید جاننے کی خواہش کرتے۔میں نے انہیں کرکٹ کی ایک گیند تحفے کے طور پر پیش کی۔وہ آج تک ان کی میز پر موجود ہے۔

پروفیسر سوگی موتو جاپان کی یکسانیت سے بھی بہت تنگ تھے۔پوری قوم کا معیار زندگی ایک جیسا ہے تو پھر اونچ نیچ کوئی نہیں۔ایک ہی معیار کا لباس،مکان،بود و باش ہے۔اس کے علاوہ سارا سال کام کرنا معمول ہے۔یعنی چھٹیاں بہت کم ہیں۔خانگی زندگی کا کھوکھلا پن اس کے علاوہ ہے۔

وہ اکثر کہتے تھے کہ ہم کھڑکی کھولتے ہیں تو ہر طرف کنکریٹ کے جنگل نظر آتے ہیں۔صبح کے نکلے رات کو گھر پہنچتے ہیں۔ایسے میں تفریح کا ذریعہ یہی ہے کہ ہر سال گھر کا سامان تبدیل کر دیا جائے۔نیا سامان گاہے گاہے آتا رہے اور دلچسپی کا سبب بنتا رہے۔

اس کے علاوہ وہ جاپانی معاشرے پر تنقید کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے اور میری باتیں سن کر اکثر کہا کرتے تھے کہ یار تم تو بہت مزے کی زندگی گزار رہے ہو۔اور حقیقت بھی یہی ہے۔اگر آپ کو پاکستان میں مالی آسودگی میسر آ جائے تو اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔مجھے زندگی میں ان گنت مواقع ملے کہ کسی ترقی یافتہ ملک میں چلا جاؤں مگر میں نے ایسا کبھی سوچا ہی نہیں۔نتیجہ یہ کہ اللہ نے مجھے اپنے وطن میں ہی بہت عزت اور کامیابی دی ہے۔اور اس کا

احسان ہے کہ مجھے فیصل آباد میں ہی تمام مواقع ملتے رہے۔اس طرح خانگی زندگی پر بھی کوئی دباؤ نہیں پڑا۔

مگر یہ اپنی اپنی ترجیحات کی بھی بات ہے۔میرے لئے انسانی رشتے بہت اہم ہیں۔ بیوی بچے، ماں باپ، بہن بھائی، دوست سب کا ایک مقام ہے۔ جو لمحہ ان کے بغیر گزر گیا وہ پھر نہیں آنا۔میرے والد محترم بھی ہمیشہ یہی نصیحت کرتے تھے کہ دوسرے ممالک میں اعلیٰ تعلیم کے لئے ضرور جاؤ مگر رہنے کے لئے نہیں۔اسی طرح میرے لئے درجہ بدرجہ میرا ملک، میرا شہر، میرا محلہ، اور میری گلی سب سے اہم ہیں۔

دو سال پہلے نیپال میں ایک بنگلہ دیشی سائنسدان سے ملاقات ہوئی جو بہت عرصہ پہلے امریکہ چلا گیا تھا۔اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ کہہ رہا تھا کہ اس کی ماں بستر مرگ پر تھی۔وہ بنگلہ دیش جا تو رہا تھا مگر اس کی مصروفیات ایسی تھیں کہ وہ اپنے گھر ایک گھنٹہ سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

ایسی کامیابیوں کا کیا فائدہ؟

اس موضوع پر پنکج ادھاس کی گائی ہوئی نظم 'چھٹی آئی ہے، چھٹی آئی ہے' ایک شاہکار ہے۔

•••

پروفیسر سوگی موتو سے میرا آج بھی رابطہ ہے۔وہ میرے کئی پی ایچ ڈی کے طالب علموں کے غیر ملکی ممتحن بنے ہیں۔میں ان کا بے حد مشکور ہوں کہ میرے کہنے پر ۲۰۱۳ عیسوی میں اسلام آباد ایک کانفرنس میں تشریف لائے۔جاپانی تو عام حالات میں بھی پاکستان آنے سے ڈرتا ہے۔اس وقت تو دہشت گردی عروج پر تھی۔انہوں نے میری درخواست کا لحاظ کیا۔سب لوگ حیران تھے کہ میں نے انہیں کیسے راضی کرلیا۔

اسی طرح میرے کچھ امریکی اور انگریز دوستوں نے میرا مان رکھا تھا اور میرے بلانے پر ۲۰۰۷ عیسوی میں اسلام آباد تشریف لائے تھے۔

پروفیسر سوگی موتو سے تو میرا رابطہ ہے مگر افسوس پروفیسر متسودا سے نہیں۔اس کی وجہ میری اپنی نالائقی ہے۔پروفیسر متسودا کو کمپیوٹر سے چڑ تھی۔وہ کاغذ پر ہاتھ سے لکھتے تھے اور ان کی

سیکریٹری ٹائپ کرتی تھی۔ میں نے انہیں کبھی کسی کمپیوٹر کے آس پاس بھی نہیں دیکھا۔

میرے جاپان سے آنے کے بعد ہم ہاتھ سے لکھے خطوط کا باقاعدگی سے تبادلہ کرتے رہے۔ ان کا خیال تھا (اور بالکل درست خیال تھا) کہ ہاتھ سے لکھے خط میں لکھنے والے کا چہرہ نظر آتا ہے اور اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ مجھ پر کام کا شدید دباؤ تھا۔ ویسے بھی ہاتھ سے لکھنے کی عادت نہیں رہی تھی۔ میں نے کمپیوٹر پر خط ٹائپ کیا اور دستخط کر کے بھیج دیا۔ ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ وہ کمپیوٹر میں محفوظ ہو جائے گا۔ مگر پروفیسر صاحب ناراض ہو گئے۔ میں نے ایک دو دفعہ ہاتھ سے خط لکھ کر معذرت بھی کی مگر جواب نہیں آیا۔ کمپیوٹر وہ استعمال نہیں کرتے تھے کہ ای میل ہو اور میرے پاس فون نمبر بھی نہیں تھا۔ یہ خدشہ ہوا کہ خدانخواستہ کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو۔

جب پروفیسر سوگی موتو پاکستان تشریف لائے تو میں نے پروفیسر متسودا کا پوچھا۔ کہنے لگے کہ ایک دو سال پہلے کسی پارٹی میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت تو وہ صحت مند تھے۔ ان دونوں حضرات میں ذہنی ہم آہنگی نہیں تھی، اس لئے اتنی خبر ملنا بھی غنیمت تھا۔

•••

اس موقع پر اگر کچھ ذکر اسسٹنٹ پروفیسر ہوری گوچی (Horiguchi) کا نہ ہو تو زیادتی ہو گی۔ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے مگر انتہائی قابل اور تیز طرار انسان تھے۔

وہ پروفیسر سوگی موتو سے آٹھ دس سال چھوٹے تھے مگر دونوں کی سوچ میں مماثلت تھی۔ یا یوں کہیے کہ وہ جاپان کی جدید نسل کے نمائندہ تھے جبکہ پروفیسر متسودا پچھلی نسل سے تعلق رکھتے تھے جس نے جنگ کی تباہ کاریاں دیکھی تھیں اور پھر امریکنوں کا تسلط بھی سہا تھا۔

اس نسل کی نفسیات کو بیان کرنا خاصا مشکل ہے۔ ایک طرف تو جنگ میں ہار کے بعد انہوں نے اپنی وطنیت کے جذبے کے بل بوتے پر جاپان کو دنیا کا جدید ترین ملک بنایا اور اس دوران بہت مشکل حالات سے گزرے۔ دوسری طرف لاشعوری طور پر انہوں نے امریکہ کی برتری کو تسلیم کر لیا۔

جس دور میں میں جاپان میں تھا، وہ صنعتی میدان میں دنیا پر چھا چکا تھا۔ کاریں ہوں یا بجلی کا سامان، امریکی مارکیٹ میں بھی آج کی طرح اس کی اجارہ داری تھی۔ مگر پروفیسر متسودا کا

جہاں کسی چیز کا انتخاب کرنا ہوتا، وہ امریکی چیز کو ترجیح دیتے۔

ان کی یہ عادت پروفیسر سوگی موتو اور ہوری گوچی کو سخت ناپسند تھی۔ ایک دن ایک مشین خراب ہوگئی۔ ڈاکٹر ہوری گوچی مجھے کہنے لگے:

'یہ امریکن ہے اور بے کار ہے۔'

وہ کھل کر تو پروفیسر متسوداسے تکرار نہیں کرسکتے تھے مگر انہوں نے چپکے سے اس مشین کو سٹور میں ڈال دیا اور نئی جاپانی مشین منگوالی۔

میری ڈاکٹر ہوری گوچی سے اچھی دوستی تھی مگر ایک دن انہیں میری ایک بات بہت بری لگی۔

مزے کی چیز یہ ہے کہ وہ بات امریکن کھیلوں پر میری تنقید تھی۔ جدید کھیلوں میں جاپان میں وہی کھیل مقبول ہیں جو امریکہ میں کھیلے جاتے ہیں۔ یعنی امریکن فٹ بال، رگبی، بیس بال اور ٹینس۔ مجھے اوّل الذکر دونوں کھیلوں میں ہنر کی بجائے طاقت کا استعمال زیادہ نظر آتا ہے۔ جس طرح ان دونوں

کھیلوں میں کھلاڑی ایک دوسرے کے اوپر گر پڑتے ہیں اور چھینا جھپٹی کرتے ہیں، مجھے بہت عجیب لگتا ہے۔

میرے منہ سے ایک دن نکل گیا کہ یہ وحشیانہ کھیل ہیں۔ ڈاکٹر ہوری گوچی تمام نوجوان جاپانیوں کی طرح ان کھیلوں کے دلدادہ تھے۔ انہوں نے میرے تبصرے کو دل میں بٹھالیا اور پورے ڈپارٹمنٹ میں یہ بات پھیل گئی۔ مگر میں اپنے موقف پر قائم رہا۔ میں نے کوئی غلط بات نہیں کی تھی۔

●●●

۶

شخصیات پر بات ہو رہی ہے تو چند دلچسپ لوگوں کا ذکر برمحل ہے۔

بنگلہ دیش کے ایک ڈاکٹر صاحب تھے۔ پورا نام یاد نہیں رہا۔ عام طور پر انہیں ڈاکٹر چوہدری پکارا جاتا تھا۔ انہوں نے MRCP کیا ہوا تھا۔ یعنی میڈیکل سپیشلسٹ تھے اور ڈھاکہ میں بہت اچھی پریکٹس تھی۔

نہ جانے انہیں کیا سوجھی، پی ایچ ڈی کے لئے جاپان چلے آئے۔ عموماً برصغیر کے ڈاکٹروں کا مزاج ریسرچ والا نہیں ہوتا۔ اور جو اتنا آسودہ حال اور کامیاب ہو، اس کی طرف سے یہ فیصلہ اچھنبے کی بات تھی۔

اس فیصلے پر ان کی بیگم بہت ناراض تھی۔ وہ بادل نخواستہ ان کے ساتھ چلی تو آئی مگر ہر وقت انہیں واپس جانے کا مشورہ دیتی رہتی۔ دوسری طرف ان کے پروفیسر نے صاف انکار کر دیا اور فیصلہ دے دیا کہ ان میں پی ایچ ڈی کرنے کی صلاحیت نہیں۔

ان کی کوشش تھی کہ اتنی مشکل سے حاصل کئے ہوئے سکولرشپ کو ضائع نہ کیا جائے اور کم از کم دو سال کی مدت پوری کی جائے۔ کسی طرح انہوں نے اپنی بیگم کو بھی منا لیا۔

ڈاکٹر چوہدری بہت شریف النفس اور ملنسار تھے۔ ہم اچھے دوست بن گئے۔

ان کے ساتھ نارا کا ایک دورہ کبھی نہیں بھولے گا۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس دن سردی بہت تھی۔ درجہ حرارت نقطہ انجماد کے قریب تھا۔ دوسری وجہ ان کا ایک دوست تھا

جو تھا تو جرمن مگر اب برازیل میں مقیم تھا۔ میں نے بڑے بڑے خبطی فوٹوگرافر دیکھے ہیں (کچھ کا ذکر اگلے ابواب میں آئے گا) مگر شوق کے اس مقام تک کوئی نہیں پہنچا تھا۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب ہر تصویر کی خاصی قیمت دینی پڑتی تھی۔ یعنی پہلے فلم ڈلواؤ پھر پرنٹ بنواؤ۔ ان صاحب کو جو بھی چھوٹی بڑی مورتی یا آثارِ قدیمہ نظر آتے، ان کی دو تین زاویوں سے تصویر کھینچتے۔ کبھی بیٹھ کر، کبھی کھڑے ہو کر۔ کبھی سامنے سے، کبھی سائڈ پوز۔ اس طرح انہوں نے سینکڑوں تصویریں کھینچیں۔ ایک خاص بات کا تو میں نے ذکر ہی نہیں کیا۔ وہ پہلے مورتی کی قدرتی حالت میں تصویر کھینچتے تھے، پھر اس پر پانی ڈالتے تھے تاکہ رنگ گہرا ہو جانے سے خطوط ابھر آئیں۔ پھر وہی تصویروں کا دور شروع ہو جاتا۔

جب میں اپریل ۱۹۹۱ عیسوی میں جاپان سے واپس آنے والا تھا تو ڈاکٹر چوہدری کے واپس جانے میں کچھ مہینے باقی تھے۔

ایک دن شام کو ہوسٹل کے ساؤنڈ سسٹم پر میرا نام پکارا گیا۔ میں فون سننے گیا تو دوسری طرف ڈاکٹر چوہدری تھے۔

قصہ یہ ہوا تھا کہ انہوں نے میرے اعزاز میں الوداعی دعوت کا بندوبست کیا تھا اور اپنے گھر پر پندرہ بیس مشترکہ دوستوں کو بلایا تھا۔ سارا دن ان کی بیگم باورچی خانے میں مصروف رہی۔ سب لوگ جمع ہو گئے مگر میں غیر حاضر تھا۔ یہ سب کے لئے تشویش کی بات تھی۔ سب جانتے تھے کہ میں وقت کا پابند ہوں۔

اچانک ڈاکٹر چوہدری کو یاد آیا کہ وہ مجھے تو بتانا ہی بھول گئے تھے۔ یعنی مہمان خصوصی کو اطلاع ہی نہیں دی گئی تھی۔۔ اب وہ فون پر اس 'حرکت' کی معذرت کر رہے تھے اور درخواست کر رہے تھے کہ میں ان کے گھر آ جاؤں۔

اتفاق کی بات ہے کہ اس وقت میں ایک ضروری کام سے جا رہا تھا جسے ٹالنا ناممکن تھا۔ اس طرح میرے اعزاز میں دعوت میرے بغیر ہی ہوئی۔

●●●

اوسا کا یونیورسٹی میں دنیا کا دوسرے یا تیسرے نمبر پر بڑا cyclotrone تھا، جس کی وجہ سے ساری دنیا سے طبیعات کے ماہر وہاں کام کرنے آتے تھے۔

ان میں سے ایک مدراس (چنائی) سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر شرما تھے۔ یہاں یہ بتاتا چلوں کہ جنوبی ہندوستان کے لوگوں میں پاکستان کے بارے میں منفی جذبات نہ ہونے کے برابر ہیں، اس لئے وہ پاکستانیوں سے دوستی کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔

ڈاکٹر شرما کی عمر پچاس سال کے قریب تھی۔ ناٹے قد کے ساتھ بھاری جسم رکھتے تھے۔ مگران کی شخصیت پر چھا جانے والی چیزان کی فارغ البالی تھی۔

میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ گھنی ٹنڈ نہیں دیکھی۔ یعنی مذاق ہی مذاق میں میں نے ایک دن ہینڈ لینس سے ان کے سر کے بال ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر مکمل ناکامی ہوئی۔

میں نے ان سے پوچھا:

'کہیں آپ کوجک (Kojak) کے پرستار تو نہیں۔'

بولے:

'نہیں یار، کیوں مذاق کرتے ہو، یہ بھگوان کی کرپا ہے۔'

کوجک ایک ٹی وی سیریز کا کردار تھا جو روز سر پر شیو کرتا تھا۔

ڈاکٹر شرما موسیقی کے دلدادہ تھے۔ جدید ترین انڈین گانوں پر تبصرہ کرنے اور میری رائے لینے کے لئے ہفتے میں دو تین دفعہ ضرور وقت نکالتے۔

•••

مگران کرداروں سے بھی دلچسپ ایک اور کردار تھا اور اس کا تعلق پاکستان سے تھا۔

ڈاکٹر تبسم کے گھر اکثر پاکستان سے آئے لوگوں سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ ان میں زیادہ تر قالینوں کے تاجر ہوتے تھے۔ انہی میں سے ایک بٹ صاحب تھے۔ لمبے چوڑے، گورے چٹے، خوش شکل اور ٹھیٹھ لاہوریے۔ یعنی خوش باش اور لچھے دار گفتگو کے ماہر۔ بس ایک کمی تھی کہ لاہور کو لہوڑ نہیں کہتے تھے جو ڈاکٹر تبسم کے مطابق اصلی لاہوریے کی پہچان ہے۔

مجھے ڈاکٹر تبسم نے بتایا:

'یار یہ بہت دلچسپ آدمی ہے۔ جاپانی کے چند لفظ سیکھے ہوئے ہیں جن کی تعداد پندرہ بیس ہوگی۔ ان الفاظ کو پنجابی کے جملوں میں ڈال کر جاپانیوں سے گفتگو کرتا ہے اور کامیاب بزنس چلا رہا ہے۔ اس کی گفتگو کا جادو دیکھنا ہو تو کسی دن اس کے ساتھ جاؤ۔'

یہ بات سن کر مجھے اتنا اشتیاق ہوا کہ میں نے بٹ صاحب سے مصاحبت کی درخواست کر ڈالی۔ وہ زندہ دل آدمی تھے، انہیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

وہ اپنے پہلے بزنس پارٹنر کے شوروم پر پہنچے اور گفتگو کا آغاز ہوا۔ بٹ صاحب کا چہرہ بالکل سنجیدہ تھا مگر وہ پنجابی میں اپنے مخاطب کو باقاعدہ کوس رہے تھے مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ ہر جملے میں جاپانی زبان کا مناسب لفظ ڈال دیں۔ اس طرح وہ اپنی زبان کی روانی کو برقرار رکھتے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ عام زندگی میں بھی جب تک ہر جملے میں دو چار گالیوں کا تڑکا نہ لگتا وہ گفتگو کر ہی نہیں سکتے تھے۔

میں نے ایک دو منٹ تو برداشت کیا مگر جب دیکھا کہ اب ہنسی رک نہیں سکتی اور اگر میرے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تو بٹ صاحب کو شدید کاروباری نقصان ہو سکتا ہے، میں وہاں سے اٹھا اور سٹور میں مٹر گشت کرنے لگا۔

دس منٹ بعد بٹ صاحب میرے پاس آئے۔ وہ بہت خوش تھے۔ انہوں نے اپنی بدکلامی کو بڑی اچھی قیمت پر بیچ ڈالا تھا اور ایک بڑا آرڈر لینے میں کامیاب رہے تھے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ وہ خود اپنی ہنسی کیسے کنٹرول کرتے ہیں۔

انہوں نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور کہنے لگے:

'جانی، بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ میں جاپان آنے سے پہلے کئی دن ریہرسل کرتا ہوں اور بیوی کو سامنے بٹھا لیتا ہوں تا کہ ہنسی کہیں قریب بھی نہ پھٹکے۔'

میں نے کہا:

'بٹ صاحب، آپ خوش شکل ہیں، قد کاٹھ اچھا ہے، فلموں میں کیوں کام نہیں کرتے۔'

پھر ان کا قہقہہ گونجا اور بولے:

'اچھا جانی، سوچوں گا۔'

•••

ڈاکٹر تبسم کے دولت خانے پر ہی ایک جاپانی سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ اس میں مندرجہ بالا شخصیات کی طرح کوئی دلچسپی کا عنصر نہیں تھا۔ وہ تب بھی میرے لئے قابلِ احترام تھا اور اب بھی ہے۔ اس کی وجہ پاکستان سے محبت ہے۔ اس کا نام یامانے (Yamane) ہے۔ وہ ڈاکٹر

تبسم کے ساتھ گائی دائی کے شعبہ اردو میں تدریس کے فرائض انجام دیتا تھا اور دونوں مل کر بہت قابلِ قدر تحقیقی کام کر رہے تھے۔ وہ اردو بڑی روانی سے بولتا تھا۔ اس کا ڈاکٹر تبسم سے اب بھی رابطہ ہے اور پاکستان آتا جاتا رہتا ہے۔

●●●

۷

ہیروشیما کے نام سے کون واقف نہیں؟

یہ وہ بدقسمت شہر ہے جس پر دنیا کا پہلا ایٹم بم گرایا گیا۔ ۶/اگست ۱۹۴۵عیسوی بروز پیر صبح سوا آٹھ بجے امریکن ۲۹۔بی بمبار انولا گے (Enola Gay) نے جسے کرنل پال ٹیٹ چلا رہا تھا، 'لٹل بوائے' نامی ایٹم بم کو ہیروشیما پر گرایا جس سے ستر ہزار لوگ فوری طور پر لقمہ اجل بن گئے۔ سال کے آخر تک مرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ چھیاسٹھ ہزار ہوگئی۔ شہر کی ستر فیصد عمارتیں تباہ ہو گئیں۔ آنے والے سالوں میں ہونے والی ہلاکتیں شامل کر لی جائیں تو کل تعداد دو لاکھ ساٹھ ہزار بنتی ہے۔ اس کے کچھ ہی دن بعد ناگاساکی پر بھی ایٹم بم گرایا گیا۔ ان حملوں نے جاپان کی کمر توڑ دی اور اسے شکست تسلیم کرنی پڑی۔

میں نے بنگلہ دیش کے خسرو اور اردن کے علی کے ساتھ ہیروشیما جانے کا پروگرام بنایا۔ ادساکا سے ہیروشیما کا فاصلہ ۳۴۰ کلومیٹر ہے اور چار گھنٹے کا سفر ہے۔ ہم عام ٹرین سے علی الصبح روانہ ہوئے اور تقریباً ساڑھے دس بجے ہیروشیما پہنچ گئے۔

جب ایٹم بم کا سانحہ ہوا تو عمومی خیال تھا کہ یہ شہر دوبارہ آباد نہیں ہو سکے گا۔ مگر یہاں کے باہمت شہریوں نے نہ صرف اسے دوبارہ آباد کیا بلکہ پہلے سے بھی بہتر بنا دیا۔ تیس سال میں اس کی آبادی دوگنی ہوگئی۔

ہم ہیروشیما پہنچے تو قطعاً اس بات کا احساس نہیں ہوتا تھا کہ اس شہر کے ساتھ کیا بیت چکی

تھی۔ بالکل دوسرے جاپانی شہروں جیسا تھا۔ صاف ستھرا اور جدید آبادیوں سے آراستہ۔ نسبتاً چھوٹا شہر ہونے کے ناتے اتنی چہل پہل نہیں تھی جتنی اوساکا یا ٹوکیو میں ہوتی ہے۔

اب ہیروشیما کو دنیا کا امن کا دارالخلافہ قرار دے دیا گیا ہے۔ ایٹمی تباہی کے آثار صرف چند عمارات تک محدود ہیں۔ یہ وہ عمارات ہیں جن کا کم از کم ڈھانچہ باقی رہ گیا تھا۔ انہیں اسی حالت میں رہنے دیا گیا ہے۔ ان میں سب سے نمایاں A-bomb dome ہے۔ یہ ایٹمی حملہ سے پہلے ہیروشیما پریفیکچرل انڈسٹریل پروموشن ہال تھا۔

اس کے علاوہ کچھ یادگاریں بھی تعمیر کی گئی ہیں جن میں چلڈرن پیس مونومنٹ (Children Peace Monument) قابلِ ذکر ہے۔ یہ ایک لڑکی کا مجسمہ ہے جس نے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں اور ایک ہاتھ میں کاغذ کا بنا بگلا ہے۔ یہ مجسمہ خیالی نہیں، ایک لڑکی سادا کو ساساسی کا ہے جو ایٹمی تابکاری کی وجہ سے ہلاک ہوئی۔ یہ تمام یادگاریں ہیروشیما پیس میموریل پارک (Hiroshima Peace Memorial Park) میں ہیں۔ اس پارک میں کئی میوزیم اور لیکچر ہال بھی ہیں اور ہر سال دس لاکھ سے زیادہ سیاح آتے ہیں۔

اس پارک میں گھومتے ہوئے افسردگی کا طاری ہو جانا فطری امر تھا۔ کسی حساس انسان کے لئے ناممکن ہے کہ ایسا نہ ہو۔

یہ ظلم اس طاقت نے کیا جو آج امن کی علمبردار بنی پھرتی ہے۔ سوال اٹھتا ہے کہ کیا جنگ ایٹمی حملوں کے بغیر نہیں جیتی جا سکتی تھی۔ یعنی تین چار لاکھ لوگوں کو اس طرح لقمہ اجل بنا دینا کیا کوئی معمولی بات تھی؟

امریکہ جاپان کے قریبی جزیروں پر قابض ہو چکا تھا اور وہاں پر بنائے گئے فضائی اڈوں سے اڑ کر بمبار شہروں کو ملیا میٹ کر رہے تھے۔ ٹوکیو میں ایک رات میں بیس ہزار لوگ ہلاک ہوئے۔ یہ بات یقینی تھی کہ کچھ ہی عرصہ بعد جاپان ہتھیار ڈال دیتا۔ عمارتوں کی تباہی تو شاید تب بھی اتنی ہی ہوتی مگر اتنی انسانی جانیں ضائع نہ ہوتیں۔

مگر طاقتور سے یہ سوال کون پوچھے اور اس کا احتساب کون کرے۔

ع ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

●●●

ترک خاتون شفق کے جاپانی خاوند توشی ہیرو سے میری اچھی دوستی تھی۔ جب کبھی وہ زیرعتاب ہوتا اور میاں بیوی کی بول چال بند ہوتی تو میرے پاس آ جاتا۔ اگر میرے پاس وقت ہوتا تو ہم اکٹھے گھومنے پھرنے بھی نکل جاتے۔

توشی ہیرو ایک دن مجھے ایک فلمی شہر میں لے گیا۔ یہ کیوٹو میں ہے اور اسے ایگا مورا (Eigamura) بھی کہتے ہیں۔ یہ آج سے دو ڈھائی سو سال پرانے ایڈو (Edo) دور کی نمائندگی کرتا ایک مصنوعی شہر ہے۔ اس شہر میں اسی دور کی گلیاں اور مکانات بنائے گئے ہیں حتیٰ کہ بازار حسن، پولیس چوکیاں اور اس زمانے کے مشہور پل بھی تعمیر کئے گئے ہیں۔ اس 'شہر' میں ہر وقت کسی نہ کسی فلم یا ٹی وی ڈرامے کی شوٹنگ ہوتی رہتی ہے۔

مگر اس شہر میں گھومنا پھرنا مہنگا شوق ہے۔ ٹکٹ بہت زیادہ ہے۔

ہم وہاں پہنچے تو جیسے دو صدی پیچھے جست لگا دی۔ کوئی شوٹنگ ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی مگر قدیم لباس میں ملبوس لوگ روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔ یہ اس فلمی شہر کے ملازم تھے اور مختلف قسم کے کام کر رہے تھے یا کرتے نظر آ رہے تھے۔

توشی ہیرو نے مشورہ دیا کہ ان کے ساتھ تصاویر بنائی جائیں۔ جس سے بھی درخواست کی وہ فوراً تیار ہو گیا۔ چاہے ہم دس تصویریں بنائیں اور جتنا مرضی وقت لگے، مجال ہے ان کے ماتھے پر شکن آئے۔ ہم اس شہر میں کافی دیر تک گھومتے رہے۔ کہیں تو ہمیں تیزی سے دوڑتے ہوئے سامورائی (samurai) یعنی قدیم جاپانی سپاہیوں کا سامنا ہوا جیسے وہ کسی محاذ پر جا رہے ہوں اور کہیں اچانک گیشاؤں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ گیشا (geisha) کو اگر لکھنؤ کی طوائف کے برابر گنا جائے تو شاید مناسب ہو۔ یعنی ان کا پیشہ جسم فروشی نہیں، بلکہ امرا اور شرفا اپنے بچوں کو آداب محفل سکھانے کے لئے ان کے پاس بھیجتے تھے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کے برے نتائج بھی نکلتے تھے۔

یہ مصنوعی گیشائیں بہت بنی ٹھنی تھیں اور قدیم جاپانی لباس میں ملبوس واقعتاً توجہ کا مرکز بن جانے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔

اس شہر میں تو داخلہ ٹکٹ لے کر گھوما جا سکتا تھا مگر اگر جیب اجازت دیتی ہو تو وہاں نِنجا (ninja) تھیٹر بھی تھا۔ اس کے علاوہ ایک 3D تھیٹر بھی دعوت نظارہ دیتا تھا۔

●●●

آپ نے مشہور زمانہ بلٹ ٹرین کا نام تو سنا ہوگا۔اب تو اس دوڑ میں کئی ملک شامل ہو گئے ہیں جن میں چین قابل ذکر ہے مگر اس زمانے میں بلٹ ٹرین بنانے میں جاپان کی اجارہ داری تھی۔اب بھی تیز رفتاری میں عالمی ریکارڈ جاپان کے پاس ہی ہے۔

بلٹ ٹرین کو جاپانی زبان میں شن کان سین (Shinkansen) کہتے ہیں۔اس نیٹ ورک کو پانچ جاپانی کمپنیاں چلاتی ہیں اور اس کا آغاز ۱۹۶۴ عیسوی میں ہوا۔عموماً اس کی رفتار ۲۴۰ سے ۳۱۰ کلومیٹر فی گھنٹہ ہوتی ہے۔روائتی بلٹ ٹرین کی زیادہ سے زیادہ رفتار ۴۵۰ کلومیٹر فی گھنٹہ تک ریکارڈ کی گئی ہے مگر مقناطیسی قوت سے چلنے والی بلٹ ٹرین نے ۲۰۱۵ عیسوی میں ۶۰۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کا عالمی ریکارڈ بنایا۔

ٹوکیو اور اوساکا کے درمیان چلنے والی بلٹ ٹرینیں ہر سال پندرہ کروڑ لوگوں کو تیز رفتار سفر کی سہولت فراہم کرتی ہیں اور اب تک یہ پانچ ارب لوگوں کے زیر استعمال آ چکی ہیں۔یہ ایک عالمی ریکارڈ ہے۔

یہ قدرتی بات ہے کہ مجھے بھی بلٹ ٹرین پر سفر کرنے کا شوق تھا۔اس کا موقع اس طرح فراہم ہوا کہ پروفیسر صاحب نے مجھے ناگویا (Nagoya) جانے کو کہا۔ناگویا جاپان کا تیسرا بڑا شہر ہے۔پروفیسر صاحب کے چھوٹے بھائی بھی مائیکروبیالوجی کے پروفیسر تھے اور ناگویا یونیورسٹی میں اس شعبہ کے سربراہ تھے۔یہ ایک مطالعاتی دورہ تھا تاکہ میں اپنے علم میں اضافہ کرسکوں۔

بلٹ ٹرین دیکھنے میں بہت شاندار ہوتی ہے۔ہوائی جہاز کی طرح کا اگلا حصہ بس یہ کہ پر نہیں ہوتے۔مگر میں نے جب اس میں سفر کیا تو یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ قدرے مایوسی ہوئی۔یعنی کھڑکی سے باہر دیکھیں تو تیز رفتاری کا اتنا اندازہ نہیں ہوتا اور جھٹکے عام ٹرین سے کچھ زیادہ ہی تھے۔

مگر مسافر کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ باہر کا نظارہ بہتر ہے یا نہیں۔اسے تو یہ پتہ ہوتا ہے کہ سفر آدھے سے بھی کم وقت میں طے ہوگیا۔یہی وجہ ہے کہ ٹوکیو اور اوساکا کے درمیان بلٹ ٹرین کا ٹکٹ غالباً ہوائی ٹکٹ سے کچھ زیادہ ہی ہے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ بلٹ ٹرین ہوائی جہاز سے بھی تیز ہے۔وجہ یہ ہے کہ بلٹ ٹرین پر آپ شہر کے اندر کئی مقامات سے سفر کا آغاز کرسکتے ہیں جب کہ ہوائی سفر کے لئے ائرپورٹ جانا پڑتا ہے جو شہر سے باہر ہوتا ہے۔اگر کل وقت دیکھا جائے تو بلٹ ٹرین سے منزلِ مقصود پر جلد پہنچا جاسکتا ہے۔

اوساکا سے ناگویا کے سفر کے دوران ہر طرف پہاڑ ہی پہاڑ نظر آئے۔ جاپان کا ستر فیصد علاقہ پہاڑی ہے۔

●●●

پاکستان سے امریکہ جانا نہ تب آسان تھا نہ اب ہے۔ میں نے سوچا جاپان سے ویزہ لگنے میں دشواری نہیں ہوگی مگر جتنی آسانی سے یہ کام ہوا اس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میرا کام مکمل ہو چکا تھا اور ایک قسم کا میں وقت ہی پورا کر رہا تھا۔ یہ ستمبر ۱۹۹۰ عیسوی کی بات ہے۔ میں نے پروفیسر صاحب سے اپنی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے فوراً اجازت دے دی۔

پروفیسر صاحب نے مجھے ایک خط لکھ دیا جس میں تمام تفصیلات درج تھیں۔ میں امریکن سفارتخانے گیا۔ مجھے ایک فارم دیا گیا جو میں نے دس منٹ میں بھر دیا۔ میں نے تین مہینے والے سنگل انٹری ویزے کی درخواست کی۔ فارم بھر کر متعلقہ شخص سے پوچھا کہ کب آؤں؟ اس نے کہا کہ آپ یہیں بیٹھیں۔ آدھے گھنٹے بعد مجھے پاسپورٹ واپس تھما دیا گیا۔ مجھے ایک سال کی مدت کا multiple visa دے دیا گیا تھا۔

میں نے صرف ٹکٹ خریدنا تھا جو بیس ہزار روپے میں مل گیا۔ امریکہ کے اخراجات سان فرانسسکو میں مقیم میری بہن نجمہ لطیف اور کلیولینڈ میں مقیم میرے خالہ زاد بھائی ڈاکٹر منیر مرزا نے اٹھانے تھے۔

تفصیلی ذکر کا تو یہ موقع نہیں مگر مختصراً یہ کہ جاپان امریکہ سے بہت بہتر تھا۔ امریکہ میں وسعت بہت تھی، فاصلے بہت تھے۔ مگر عام آدمی کی حالت اور معیار زندگی کے لحاظ سے جاپان بہت آگے تھا۔ میں نے جاپان میں کبھی کوئی بھکاری نہیں دیکھا۔ امریکہ میں ہر مصروف شاہراہ پر بھکاری نظر آتے تھے۔ اسی طرح جاپان میں کبھی گندگی نظر نہیں آئی۔ امریکہ میں کئی علاقے ایسے تھے جن کی مثال پاکستان میں بھی کم ہی نظر آئے گی۔

اور سب سے بڑا فرق کہ جاپان میں ہر کسی کو تحفظ حاصل ہے۔ ایک چھوٹا بچہ بھی ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بے خطر جا سکتا ہے۔ امریکہ میں ہر بڑے شہر میں ایسے علاقے ہیں جہاں سے دن کے وقت بھی گزرنا محفوظ نہیں۔

●●●

۸

فروری ۱۹۹۱ عیسوی کی بات ہے۔ ایک دن پروفیسر صاحب نے بتایا کہ شیوبارا (Shiobara) میں ایک کل جاپان کانفرنس ہو رہی ہے اور سب لوگوں کو اس میں شرکت کرنی ہے۔ مقالے تو پروفیسر سوگی موتو اور اوکابے نے پڑھنے تھے مگر باقی لوگوں کو ان کی ہمنوائی کے لئے جانا تھا۔

شیوبارا ٹوکیو کے شمال میں ۱۸۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک قصبہ ہے یعنی اوساکا سے سات سو کلومیٹر دور ہے۔ پروفیسر صاحب کا فیصلہ تھا کہ اساتذہ تو اپنی اپنی گاڑیوں میں جائیں گے جب کہ مجھے اور چین کے ماکو اپنے طور پر جانا تھا۔

ہم دونوں نے اوساکا سے ٹوکیو بس پر جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ سات آٹھ گھنٹے کا رات کا سفر تھا۔ یہ سفر اتنا ہی آرام دہ تھا جتنا ہو سکتا تھا۔ یعنی بہترین سیٹیں، ٹانگیں پسارنے کے لئے وافر جگہ اور بس کے اندر ہی ٹائلٹ۔ مگر بس بس ہی ہے۔ لیٹنے کا اہتمام تو نہیں ہو سکتا تھا۔ بس دو تین جگہ رکی بھی اور پانچ دس منٹ چہل قدمی بھی کی مگر منزلِ مقصود تک پہنچتے پہنچتے کافی تھکاوٹ ہوئی۔

چونکہ کانجی ماکے گھر کی لونڈی تھی اور جاپانی پڑھنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا، میں ایک فرمابردار نائب کی طرح اس کے پیچھے چلتا رہا۔ مرکزی ریلوے سٹیشن بس ٹرمینل کے قریب ہی تھا۔ اوساکا کے بڑے بڑے ریلوے سٹیشن اس سٹیشن کے سامنے بونے لگ رہے تھے۔ اگر ماننہ ہوتا تو میں نے وہیں گھومتے رہنا تھا۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد ہماری ٹرین روانہ ہوئی اور دو گھنٹے کے سفر نے ہمیں شیو بارا پہنچا دیا۔

•••

دن کے گیارہ بجے تھے۔ ہر طرف بڑے بڑے پندرہ بیس منزلہ فائیو سٹار ہوٹل تھے مگر سڑکیں بالکل سنسان تھیں۔ بڑی حیرانی ہوئی۔ اتفاق سے جس ہوٹل میں ہم ٹھہرے تھے اور جہاں شام تک ہمارے اساتذہ نے پہنچنا تھا، اس میں کینیا کا ایک طالب علم علی بھی تھا۔ اس کا تعلق ٹوکیو کی کسی یونیورسٹی سے تھا۔

ہوٹل میں بیٹھے رہنا تو بے وقوفی تھی۔ ہم باہر نکلے اور ایک قریبی جنگل کا رخ کیا۔ وہ بہت گھنا اور سنسان جنگل تھا۔ مگر تین جوان سورماؤں کو کیا پرواہ جب کہ ان میں علی جیسا شیخی خور بھی موجود ہو۔ ہم چلتے چلتے ایسی جگہ پر پہنچے جہاں دن کے وقت بھی اندھیرا تھا۔ علی شاید ہمیں ابھی اور آگے لے جاتا مگر اب بھوک چمک رہی تھی اس لئے فیصلہ ہوا کہ واپس چلا جائے۔

ہم مزے سے گپیں لگاتے، تصویریں بناتے جا رہے تھے کہ اچانک ایک دیوہیکل کتا درختوں سے چھلانگ لگا کر ہمارے سامنے کھڑا ہو گیا۔ خوف زدہ ہونا فطری تھا مگر یہ دیکھ کر کچھ اطمینان ہوا کہ اس کے گلے میں پٹہ اور زنجیر تھے۔ جاپان میں کبھی آوارہ کتا نہیں دیکھا۔

اب دونوں فریق آمنے سامنے تھے۔ ہمارے مخالف نے مذاکرات کا آغاز کیا۔ علی نے ذرا جارحانہ جواب دیا مگر جلد ہی حریف کے بگڑتے تیور دیکھ کر ہماری طرح بھیگی بلی بن گیا اور خاموشی سے انتظار کرنے لگا کہ اب کیا۔

بقول شخصے اب جو کرنا تھا اسی نے کرنا تھا۔

فی الوقت فریق مخالف تمہید ہی باندھ رہا تھا اور ہم دعا گو تھے کہ سلسلہ کلام جاری رہے۔ پطرس مرحوم کہہ گئے ہیں کہ اگرچہ انگریزی کا محاورہ ہے کہ barking dogs seldom bite مگر کسے پتہ ہوتا ہے کہ کب وہ بھونکنا بند کر دیں اور کاٹنا شروع کر دیں۔

جب لگ رہا تھا کہ اب موصوف اگلا قدم اٹھانے والے ہی تھے یعنی ان کے چمکتے ہوئے سفید دانت ایک ایک کر کے گنے جا سکتے تھے، اچانک ایک حسین و جمیل لڑکی رحمت کا فرشتہ بن کر نازل ہوئی اور اسے بڑے پیار سے ڈانٹ پلائی۔ نتیجتاً وہ ہمیں بھول کر اس لڑکی کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہونے لگے۔

اب لڑکی ہماری طرف متوجہ ہوئی اور کم از کم دس پندرہ دفعہ گھٹنوں تک جھک کر معافی مانگی۔ ہم نے کہا کوئی بات نہیں۔ ہم کون سا ڈر گئے تھے۔ اس مکالمے کے بعد اس نے اپنی راہ لی اور ہم شتابی سے ہوٹل پہنچے۔

ہم بر گرِ کھا کر لیٹ گئے کہ رات کے بے آرام سفر کی تھکاوٹ تھی۔ مغرب سے کچھ پہلے آنکھ کھلی۔ ہمارے اساتذہ ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔

●●●

ہوٹل سے باہر نکلے تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ ہر طرف روشنیوں کی بھر مار تھی اور سڑکوں پر کندھے سے کندھا ٹکرا رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہاں راتیں جاگتی تھیں۔ اور جب راتیں جاگتی ہوں تو تمام امکانات موجود ہوتے ہیں۔ بس اسے چھوٹا سا لاس ویگاس (Las Vegas) سمجھ لیجئے۔

مغرب تک اساتذہ کا قافلہ بھی پہنچ گیا۔ ہم جاپانی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے اور تاتامی پر بستر لگے ہوئے تھے۔ مجھے اور ماکو تو کوئی فکر نہیں تھی۔ ہم تو صرف ہمنوائی کے لئے آئے تھے، مگر جنہوں نے مقالے پڑھنے تھے وہ اس تیاری میں لگ گئے۔ ساری رات بڑے بڑے بلب جلتے رہے اور ان کا بحث مباحثہ جاری رہا۔ میں تو گھپ اندھیرے میں سونے کا عادی ہوں۔ نیند کہاں آنی تھی۔ کبھی اس کروٹ، کبھی اس کروٹ۔ احتجاج بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بس جاگتے رات گزار دی۔

اگلا دن کانفرنس کے ہنگامے میں گزرا۔ اساتذہ نے اپنے مقالے پڑھے۔ ہمارا تعلق یوں بھی نہیں بنتا تھا کہ زبان جاپانی تھی۔ کچھ سمجھ آتی تھی کچھ نہیں۔ ابھی ہمارا ایک رات کا قیام اور تھا اور اس شام بہت کچھ دیکھا۔ وہ بیان تو نہیں ہوسکتا مگر اتنا لکھنے کی گنجائش ہے کہ تمام 'معززین' کو تقریباً برہنہ حالت میں ایک ہی تالاب میں نہاتے دیکھا۔ برس در برس کی چڑھی تہیں اترنے لگیں اور چند ہی لمحوں میں معصوم بچوں کا ظہور ہوا۔ وہ اپنے دل کے ارمان نکال رہے تھے۔ وہ منظر ناقابلِ فراموش تھا۔ فضا عمر رسیدہ بچوں کی کلکاریوں سے مترنم ہو رہی تھی۔

اگلی صبح اساتذہ تو اپنی کاروں میں بیٹھ کر اوساکا کی طرف محوِ سفر ہو گئے اور ہم دونوں سوچنے لگے کہ واپسی کیسے ہو۔ طے یہ ہوا کہ ٹوکیو میں دو تین گھنٹے گزار کر بلٹ ٹرین کی عیاشی کی جائے۔ یہ شوق مہنگا تو تھا مگر وقت کی بچت تھی اور یہ بھی لالچ تھا کہ راستے میں ماؤنٹ فیوجی کو دیکھیں گے۔

ٹکٹ ملنے میں دشواری نہیں ہوئی اور دائیں طرف کی سیٹیں بھی مل گئیں جو اس مقصد کے لئے ضروری تھیں۔

●●●

میں نے ہوائی سفر کے دوران ماؤنٹ فیوجی کی بہترین تصویریں کھینچی ہوئی تھیں جن میں اس آتش فشاں کا برف پوش دہانہ بھی مکمل جزئیات کے ساتھ نظر آتا تھا۔ مگر زمین کی سطح سے اسے دیکھنا ایک الگ ہی تجربہ ہے۔

اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ماؤنٹ فیوجی کے آس پاس کوئی اور پہاڑ نہیں۔ اس کی اٹھان سطح سمندر سے ہے۔ یعنی ساڑھے بارہ ہزار فٹ اونچا پہاڑ ایک الٹی کون (cone) کی شکل میں سطح زمین سے اٹھتا ہے اور اس کے کسی زاویے میں کوئی خامی نہیں۔ اس کا بالائی ایک تہائی حصہ آدھا سال برف سے ڈھکا رہتا ہے اور عموماً اس پر ایک چھتری نما بادل بھی بن جاتا ہے۔

ہمارے ہاں اس سے دوگنی سے بھی زیادہ بلندی کے پہاڑ ہیں مگر اپنے بیس کیمپ سے ان کی سیدھی اٹھان نہیں۔ شاید کے ٹو ایک استثنا ہو۔

جاپانی ماونٹ فیوجی کو کسی دیوتا کی طرح چاہتے ہیں۔ اس لئے اسے ادب سے فیوجی سان (Fuji san) کہا جاتا ہے۔ اس کی تصاویر جاپان کی سب سے معروف تصاویر ہیں اور انہیں جاپان کی پہچان سمجھا جاتا ہے۔ اس کے گردونواح میں پانچ جھیلیں ہیں اور شمال مغرب میں ایک گھنا جنگل ہے۔ اکثر جاپانی یہ یقین رکھتے ہیں کہ اس جنگل میں بھوتوں کے ڈیرے ہیں۔

یہ پہاڑ جتنا خوبصورت ہے اتنا بے ضرر نہیں۔ یہ تین سو سال پہلے لاوا اگل چکا ہے اور کئی سائنسدانوں کو اندیشہ ہے کہ مستقبل قریب میں یہ پھر آگ برسائے گا۔

ہماری خوش نصیبی تھی کہ موسم صاف تھا اور ہم نے ماؤنٹ فیوجی کو جی بھر کے دیکھا۔ ٹرین سے ہی سہی۔ ویسے تو ہزاروں لوگ ہر سال اس کی چوٹی کے قریب پہنچتے ہیں۔

جاپان میں ماؤنٹ فیوجی ہی واحد اونچا پہاڑ نہیں۔ اس کے شمال میں دو ڈھائی سو کلومیٹر دور اُونچے پہاڑوں کا ایک وسیع سلسلہ ہے جسے Japanese Alps کہا جاتا ہے۔ ان پہاڑوں میں سب سے اونچا ماؤنٹ کیتا (Mount Kita) ہے جس کی بلندی ساڑھے دس ہزار فٹ ہے۔

●●●

اب میری واپسی کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ پروفیسر صاحب کی خواہش تھی کہ میں کچھ عرصہ اور رُک جاؤں تاکہ جو کام ہم کر رہے تھے وہ مکمل ہو جائیں۔ مگر میں گھر آنے کے لئے بے تاب تھا۔ گھر والے بھی شدت سے منتظر تھے۔

میں نے آخری دو مہینوں میں دن رات کام کیا تاکہ تکمیل کے قریب تر ہو جائے۔

میں ۳۰ مارچ ۱۹۹۱ عیسوی کو وطن واپس آ گیا۔

•••

حصہ دوم

باب چہارم
(اپریل۱۹۹۳تا ستمبر۱۹۹۴عیسوی)

ا

جاپان جانے سے پہلے میں محکمہ صحت پنجاب کا ملازم تھا اور پنجاب میڈیکل کالج فیصل آباد میں میری بطور لیکچرر تعیناتی تھی۔ میں ex-Pakistan leave لے کر جاپان گیا تھا۔

جب میں جاپان سے واپس پاکستان پہنچا تو اس خوش فہمی میں تھا کہ مجھے فوراً اپنی پہلے والی جگہ مل جائے گی۔ مگر یہاں تو دنیا ہی اور تھی۔ نہ صرف پنجاب میڈیکل کالج مجھے قبول کرنے سے انکاری ہو گیا بلکہ پنجاب کے محکمہ صحت کو بھی میرے لئے کوئی جگہ نہیں ملی۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی کو پرواہ ہی نہیں تھی۔ نفسانفسی کا عالم تھا۔ پنجاب میڈیکل کالج میں کلرکوں کے پیچھے لگ کر کچھ دبی ہوئی آسامیاں نکلوائیں اور پرنسپل کی منت سماجت کر کے محکمہ صحت کو خط بھی لکھوایا کہ ان میں سے کسی بھی آسامی کے متبادل مجھے تنخواہ دے کر رکھ لیا جائے۔ یہ کوئی انوکھی چیز نہیں تھی۔ یہ عام طریقہ کار ہے۔ مگر میرے لئے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ میں کوئی غیر اخلاقی کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔

حکومتِ پنجاب کے محکمہ صحت کی کارکردگی پر ایک لمبی ہجو لکھنے کو دل کرتا ہے۔ میں اس کا اتنا ستایا ہوا ہوں۔ مختصراً جب میں ۱۹۹۵ عیسوی میں دوسری بار جاپان سے واپس آیا تو اگر میرے بہت عزیز دوست ڈاکٹر اشتیاق اپنا اثر ورسوخ استعمال نہ کرتے تو میرے لئے National Institute for Biotechnology and Genetic Engineering میں (جسے عرفِ عام میں NIBGE کہا جاتا ہے) جانا ناممکن ہوتا۔ مگر یہ کام اتنی آسانی سے نہیں ہوا۔ ہم دونوں کو کئی بار لاہور جانا پڑا۔ اس محکمہ کی کارکردگی کا یہ عالم ہے کہ میں نے پنجاب حکومت کی

ملازمت ۱۹۹۵عیسوی میں چھوڑی تھی مگر اب تک میری مسلسل کوشش کے باوجود پنشن کے معاملات طے نہیں ہوئے۔کاش ہماری حکومتیں پل اور سڑکیں بنانے کے ساتھ ساتھ ان اداروں کی کارکردگی بہتر بنانے کی طرف بھی توجہ دیتیں۔

اس کے برعکس اٹا مک انرجی کمیشن نے میری ریٹائرمنٹ کے دو مہینے بعد ہی اپنے حصے کی پنشن دینی شروع کر دی تھی۔اس سلسلے میں مجھے ایک دفعہ بھی اسلام آباد نہیں جانا پڑا۔

•••

قصہ مختصر میں ایک سال سے بھی زیادہ عرصہ گھر پر بالکل فارغ بیٹھا رہا۔جو شخص کام کرنے کا عادی ہو اس کے لئے فارغ بیٹھنا بڑا اذیت ناک ہوتا ہے۔آخر مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ پروفیسر متسودا کو دوبارہ درخواست دوں کہ مجھے postdoctoral سکولرشپ کے لئے بلا لیں۔مجھے پختہ امید تھی کہ یہ کام ہو جائے گا۔پروفیسر صاحب تو مجھے روک رہے تھے۔مگر اس وقت میرا خیال تھا کہ وقت پورا ہونے کے بعد ڈگری ڈاک سے منگوالوں گا۔مگر اب نظر آ رہا تھا کہ نہ صرف جاپان دوبارہ جانا پڑے گا بلکہ وہاں رہنا بھی پڑے گا۔

اسی دوران میرے ایک گہرے دوست ڈاکٹر زاہد مالک نے مجھے NIBGE کے بارے میں بتایا۔یہ نام میں نے پہلی دفعہ سنا تھا۔یہ ادارہ نیا نیا بنا تھا اور اس کے ڈائریکٹر ڈاکٹر کوثر عبداللہ ملک ڈاکٹر زاہد مالک کے دوست تھے۔ڈاکٹر زاہد نے پیشکش کی کہ اگر میری مرضی ہو تو وہ بات کریں۔میں نے کہا کہ نیکی اور پوچھ پوچھ۔ڈاکٹر کوثر نے مثبت جواب دیا اور مجھے ریسرچ سیمینار کے لئے بلا لیا۔

یہ ادارہ پاکستان اٹا مک انرجی کمیشن کا ذیلی ادارہ ہے۔طریقۂ کار یہ تھا کہ نئے امیدوار سے سیمینار لیا جاتا۔اگر کمیٹی مطمئن ہو جاتی تو کیس ہیڈکوارٹر بھجوا دیا جاتا جو کہ ایک رسمی کارروائی ہوتی۔

پاکستان کے سائنسی حلقوں میں ڈاکٹر کوثر عبداللہ ملک کو کون نہیں جانتا۔بلاشبہ ان کا شمار پاکستان کے چوٹی کے سائنسدانوں میں ہوتا ہے۔NIBGE بھی انہی کی کاوشوں سے بنا اور اب یہ ادارہ عالمی شہرت رکھتا ہے۔ان کی عمر ۷۰ سال سے تجاوز کر چکی ہے مگر اب بھی وہ سائنس کے فروغ کے لئے اسی توانائی کے ساتھ سرگرم ہیں اور FC Universisty لاہور سے منسلک ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں کہ وہ صرف لیبارٹریوں میں گھسے رہتے ہوں بلکہ ان کی حیثیت king maker کی

ہے۔ نجانے کتنے سائنسدان ان سے فیض آب ہوئے ہیں۔

•••

میں جب ڈاکٹر زاہد کے ساتھ سیمینار دینے پہنچا اور سیکیورٹی والوں نے اطلاع دی تو ڈاکٹر کوثر بہ نفس نفیس گیٹ پر ہمیں لینے آئے۔ اس وقت ان کی عمر ۴۷ سال تھی مگر دیکھنے میں تیس پینتیس سال کے لگتے تھے۔

کوئی عام ڈائریکٹر ہوتا تو ہمیں پروٹوکول کے کئی مراحل سے گزر کر اس کے دفتر تک پہنچنا پڑتا۔ ڈاکٹر کوثر نے اس طرح ہمارا استقبال کرنے سے میرا دل موہ لیا اور میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ اگر میں کامیاب ہوجاتا ہوں تو اسی ادارے سے منسلک رہوں گا۔

سیمینار اچھا ہوگیا۔ اب ہیڈکوارٹر سے رسمی کارروائی ہونی تھی۔

اسی دوران پروفیسر متسودا کا خط آ گیا۔ انہیں نے مجھے ایک بڑا اسکولرشپ دلوایا تھا۔ یہ اوساکا یونیورسٹی کا تاناگوچی (Tanaguchi) سکولرشپ تھا جو میرے پہلے سکولرشپ سے ڈیڑھ گنا زیادہ تھا اور فیملی لے جانے کی گنجائش بھی تھی۔ اب میں گومگوکی کیفیت میں گرفتار ہوگیا۔ جاپان جاتا تو NIBGE کا موقع ہاتھ سے جاتا تھا۔ نہ جاتا تو پروفیسر متسودا ناراض ہوجاتے۔ میں ڈاکٹر کوثر کے پاس گیا اور پوری صورت حال بتادی۔ ان کا جواب حیرت انگیز تھا۔

کہنے لگے: 'تم یہ موقع ضائع نہ کرو۔ یہاں کی فکر نہ کرو۔ تمہاری جگہ محفوظ رہے گی۔ واپس آکر ہمارے ساتھ شامل ہوجانا۔'

ابھی ایک اور مرحلہ تھا۔ میں نے جاپان جا کر جو کام کرنا تھا وہ نیا تھا۔ NIBGE میں اس سے متعلق تمام سہولیات موجود تھیں۔ میں نے ڈاکٹر کوثر سے درخواست کی کہ کچھ دن مجھے کام سیکھنے کا موقع دیا جائے۔ انہوں نے فوراً اجازت دے دی۔ اس طرح دوبارہ جاپان جانے سے پہلے میں نے پندرہ دن NIBGE میں کام کیا۔ اس سے مجھے جاپان میں بہت فائدہ ہوا۔

گھر والوں کے لئے یہ دو سال کی جدائی برداشت کرنا ایک بڑا مرحلہ تھا۔ میں اپنی اہلیہ، بچوں، والدہ، بھائی اور بہنوں کا انتہائی ممنون ہوں کہ انہوں نے خندہ پیشانی سے اس نئی صورتِ حال سے سمجھوتا کیا۔

•••

۲

میں اپریل ۱۹۹۳عیسوی کے شروع میں دوبارہ جاپان پہنچا۔ ملک، لوگ، یونیورسٹی، اور اساتذہ سب جانے پہچانے تھے۔ اس لئے کسی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔

میرے ڈپارٹمنٹ میں سب لوگ میرے منتظر تھے۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ میرے بغیر اُداس ہو گئے تھے، وجہ یہ تھی کہ سائنسی تجربات کے وہ نتائج نہیں آرہے تھے جو میں حاصل کر چکا تھا۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ ایک شک کی فضا بھی ہے۔ یعنی یہ سمجھا جارہا تھا کہ میں نے ہیرا پھیری کے ذریعہ مطلوبہ نتائج حاصل کئے تھے۔

نام لینا مناسب نہیں، مگر یہ کام ایک سینئر سائنسدان کے سپرد کیا گیا تھا۔ جب وہ ناکام ہوا تو یہ قابلِ فہم بات ہے کہ اپنی ناکامی کو چھپانے کے لئے اس نے مجھے موردِ الزام ٹھہرایا۔ مجھے زیادہ دکھ اس بات کا ہوا کہ پروفیسر متسودا بھی کسی حد تک اس پراپیگنڈہ سے متاثر لگے۔

اس صورتِ حال کو درست کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ منہ سے کچھ نہ کہا جائے۔ عمل کر کے دکھایا جائے۔ میں خاموشی سے اپنے کام میں لگ گیا۔ جب ایک ہفتہ بعد پہلے جیسے نتائج آنا شروع ہو گئے تو سب کے منہ بند ہو گئے۔ مجھے احساس ہوا کہ غیر محسوس طور پر میری نگرانی بھی کی جارہی تھی۔

جب دو تین دفعہ ایک ہی جیسے نتائج آ گئے تو پروفیسر صاحب کے ذہن پر جو ہلکا سا شک کا پردہ تھا وہ ہٹ گیا اور میری عزت پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی۔

اب معاملات بہت آسان ہو گئے۔ میں نے کسی ذہنی دباؤ کے بغیر نئے پراجیکٹس پر کام شروع کر دیا جن کے لئے پروفیسر صاحبان کا مکمل تعاون حاصل تھا۔

•••

میں جاپان آتے ہوئے اپنے اہلِ خانہ کو تین مہینے کے لئے بلانے کا پروگرام بنا آیا تھا۔ جب دو تین ہفتوں میں معاملات معمول پر آ گئے تو میں نے پروفیسر صاحب سے ذکر کیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور انسٹی ٹیوٹ کے ریسٹ ہاؤس میں انتہائی معقول کرائے پر ایک فلیٹ کا بندوبست کر دیا۔

اس سے پہلے میری رہائش کا بندوبست کرنے میں انہیں کافی محنت کرنی پڑی تھی۔ اب میں جاپانی حکومت کا مہمان نہیں تھا، یونیورسٹی کا وظیفہ خور تھا۔ انہوں نے پروٹین انسٹی ٹیوٹ کے ہاسٹل میں مجھے جگہ دلوا دی۔

یہ چھوٹا سا ہوسٹل تھا اور ماحول بہت سنجیدہ تھا۔ سب لوگ کم از کم پینتیس چالیس سال عمر کے تھے۔ زیادہ تر لوگ میری طرح پوسٹ ڈاکٹریٹ کے لئے آئے ہوئے تھے۔ یہ ہوسٹل یونیورسٹی کی حدود سے کچھ قدم کے فاصلہ پر ہی تھا۔ مگر میرا انسٹی ٹیوٹ کیمپس میں بالکل مخالف سمت میں تھا۔ اس لئے ہوسٹل سے ڈپارٹمنٹ پہنچنے میں اتنا ہی وقت لگتا تھا جتنا پہلے ہوسٹل سے۔

بیکن ریسٹ ہاؤس جہاں میں نے اہل خانہ کے ساتھ ٹھہرنا تھا، پہلے ہوسٹل کے راستے میں تھا۔ مجھے جو اپارٹمنٹ ملا اس میں تین کمرے ایک طرف اور ڈائننگ روم، باورچی خانہ وغیرہ دوسری طرف تھے۔ اگر میں خود ایسا اپارٹمنٹ کرایہ پر لیتا تو کم از کم ساٹھ ستر ہزار ین ماہانہ دینے پڑتے مگر یہاں مجھے صرف بیس ہزار ین دینے تھے۔

•••

میرے اہل خانہ یعنی اہلیہ ڈاکٹر صالحہ اور بیٹیاں اسما اور حنا ۱۰ جون ۱۹۹۳ عیسوی کو براستہ کراچی اوساکا پہنچے۔ میں نے کچھ دنوں کی چھٹیاں لے لی تھیں تا کہ انہیں نئے ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں کوئی دقت نہ ہو۔

ان کے لئے یہ ایک نئی دنیا تھی اور ہر چیز دلچسپی کا باعث تھی۔ جس اپارٹمنٹ میں ہماری رہائش تھی وہ جاپانی طرز کا تھا یعنی فرش پر بچھی تاتامی اور کاغذ لگے دروازے تھے۔ مگر جگہ پُرسکون تھی اس لئے مانوس ہونے میں دیر نہ لگی۔ ریسٹ ہاؤس میں ایک چھوٹا سا خوبصورت باغ بھی تھا۔

ہاؤس کیپر ایک پینسٹھ سالہ خاتون تھی جس کا نام یوشیدا تھا۔ غالباً بیوہ تھی۔ وہ بہت ہی ہنس مکھ اور ملنسار تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ اسے انگریزی بالکل نہیں آتی تھی اور میرے اہلِ خانہ جاپانی سے نابلد تھے۔ مگر یہ مسئلہ ایسا نہیں تھا کہ دوستی نہ ہو۔ اشاروں کی زبان تو بچے بھی سمجھتے ہیں۔ مجھے اطمینان ہوا کہ میری غیر حاضری میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ اس زمانے میں موبائل فون تو تھا نہیں۔

یوشیدا بہت چاک و چوبند تھی اور اس کے بقول باقاعدگی سے پیرا کی کرتی تھی۔ میری اہلیہ نے اسے ایک دن کھانے پر بلایا۔ میں نے کہا بھی کہ مرچیں نہ ڈالنا جاپانی مرچیں نہیں کھاتے، مگر پاکستانی کھانا تھا اور کچھ نہ کچھ تو مرچیں ڈلنی تھیں۔ مگر اتنی سی مقدار نے بھی یوشیدا کا برا حال کر دیا۔ چہرہ سرخ ہوگیا اور وہ بہت پریشان ہوئی۔ ہم معذرت خواہ بھی ہوئے مگر ظاہر ہے جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔

ویسے یہ عجیب بات ہے۔ پاکستان سے مشرق کی طرف جائیں تو مرچوں کی مقدار بڑھتی جاتی ہے۔ ہندوستان، بنگلہ دیش، تھائی لینڈ اور پھر کوریا والے بھی مرچیں کھاتے ہیں۔ مگر یہ مرچیں سمندر کو پار نہ کرسکیں اور ۲۱۴ کلومیٹر دور جاپانی شہر فکوکا (Fakuoka) نہ پہنچیں حالانکہ تجارت صدیوں سے ہو رہی ہے۔

ایک دن یوشیدا نے بڑی مؤدب ہو کر مجھ سے شکایت کی کہ ہماری غفلت کی وجہ سے بہت قیمتی کتابیں برباد ہوگئیں۔ یہ بڑا سنگین الزام تھا۔ دراصل اس کی رہائش پہلی منزل پر تھی اور ہمارا فلیٹ دوسری منزل پر بالکل اوپر تھا۔ اس کی چھت سے یا دیوار سے پانی ٹپکا اور کتابوں پر گرا۔ اس کا خیال تھا کہ ہم نے باورچی خانہ میں نل کھلا چھوڑ دیا جس کی وجہ سے ایسا ہوا۔

میں بہت شرمندہ ہوا مگر جب تحقیق کی تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ جلد ہی پتہ چل گیا کہ کسی پائپ سے پانی رسنا شروع ہوگیا تھا۔ اب اس کے شرمندہ ہونے کی باری تھی اور وہ اتنی شرمندہ ہوئی کہ ہم پھر سے شرمندہ ہوگئے۔

اس زمانے میں پاکستان میں ایک ہزار روپے ایک بڑی رقم تھی۔ ہمارے ریسٹ ہاؤس کے پاس ہی ایک مارکیٹ تھی جس میں پی کوک (Peacock) نامی ایک سپر سٹور تھا۔ میری اہلیہ نے کچھ انڈے اور ایک ڈبل روٹی خریدی اور ہزار ین کا نوٹ نکال کر کیشئیر کو دے دیا۔ ابھی اسے کرنسی کے ریٹ کے فرق کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ سمجھی کہ سات آٹھ سو ین واپس ہوں گے مگر جب

بیس پچیس ین ہی واپس ہوئے تو بہت پریشان ہوئی۔ میں نے جب صورت حال کی وضاحت کی تو اسے اطمینان ہوا۔

اس زمانے میں بھی جاپان میں ATM مشینیں عام تھیں۔ بلکہ کچھ تو ایسی تھیں (CDM) جن میں آپ رقم جمع بھی کروا سکتے تھے۔اسی سپر سٹور کے سامنے ایسی ہی مشین تھی۔یعنی بنک جانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

●●●

۳

طے یہ ہوا کہ اہلِ خانہ کی سیاحت کا آغاز نزدیک ترین مقامات سے کیا جائے اور آہستہ آہستہ دائرہ وسیع ہوتا جائے۔ اس طرح ماحول سے مانوس ہونے کا عمل زیادہ فطری ہوگا۔

ہم جہاں مقیم تھے وہ اوسا کا شہر کے شمال میں واقع جدید ترین علاقہ تھا۔ اس کا نام سینری تھا۔ کیتا سینری یعنی شمالی سینری اور منامی سینری یعنی جنوبی سینری کا ذکر تو آچکا ہے مگر اس کے مرکز سینری چوؤ (Senri Chuo) کا تذکرہ نہیں ہوا۔ یہاں بڑی بڑی عمارات ہیں جہاں شاپنگ سینٹر اور ریسٹورنٹ بکثرت ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی اور دلچسپی کے سامان ہیں۔ اس کے قریب ہی لائف سائنس سینٹر کی بلند عمارت ہے۔ یہ سائنسی تحقیق کا بہت بڑا مرکز ہے۔

سینری چوؤ میں ہمارا استقبال ایک بحری قذاق نے کیا۔ ریلوے سٹیشن سے نکلتے ہی مرکزی عمارت سامنے ہے اور اس کا 'دربان' یہ بحری قذاق ہے جو پہلی منزل کے اوپر بیٹھا ہوا ہے اور دو تین منزلہ اُونچا ہے۔ اس نے نیلی وردی زیب تن کی ہوئی ہے اور ایک آنکھ پر کالا 'کھوپا' چڑھایا ہوا ہے۔ بنیادی طور پر ایک غبارہ ہونے کی وجہ سے یہ ہر وقت ہلتا رہتا ہے۔ دراصل یہ بچوں کی تفریح کا سامان ہے اور اس کے اتنے بڑے وجود میں کئی قسم کی سلائیڈیں لگی ہوئی ہیں اور بچوں کی اُچھل کود کا سامان بھی ہے۔

ہم نے سوچا کہ ونڈو شاپنگ بعد میں کرلیں گے۔ ابھی مغرب ہونے میں کچھ وقت باقی تھا، اس لئے چھت پر جا کر گرد و پیش اور سورج کے ڈوبنے کا نظارہ کیا جائے۔

جب ہم چھت پر گئے تو پتہ چلا کہ پوری چھت پر ایک منی گالف کورس بنایا گیا ہے اور کئی لوگ پوری سنجیدگی سے گالف کھیل رہے ہیں۔ یہ کام مفت تو نہیں ہوتا ہوگا۔ گویا یہ بھی آمدنی کا ایک ذریعہ تھا۔

غروبِ آفتاب کا منظر بہت خوب صورت تھا۔ ہم اس سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ جب اندھیرا چھا گیا اور سب لوگ رخصت ہو گئے تو ہم نے بھی نچلی منزلوں کا رخ کیا۔ صالحہ اور اسما تو ونڈو شاپنگ میں مصروف ہو گئیں اور حیرت ہے کہ کچھ خریداری بھی کی۔ حنا کی دلچسپی کھلیوں کی طرف تھی۔ ایک الیکٹرک ہاتھی پر اس کی سواری کی تصویر ابھی بھی ذہن میں محفوظ ہے۔

وہاں سے نکلے تو کچھ ہی دور abstract park تھا جہاں پر سر اُٹھاتے ہوئے بڑے بڑے رسے بنے ہوئے تھے۔ ان کے ارد گرد کئی رنگ کے فوارے اور تالاب تھے جو ماحول کو دلفریب بنا رہے تھے۔

یہ رسے دراصل جینیاتی مادے DNA کو ظاہر کر رہے تھے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ رسوں اور DNA میں کیا مماثلت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ DNA کے بھی دو حصے ہیں جو رسے کے دو حصوں کی طرح آپس میں بل کھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ مگر اصل حقیقت اتنی سادہ نہیں جزئیات میں کافی فرق ہے۔ اس لئے مجھے محسوس ہوا کہ زیادہ نفاست اور وضاحت کی ضرورت تھی۔ بہر حال یہ پارک اپنا بنیادی مقصد پورا کر رہا تھا۔ لوگوں کا ایک جمگھٹا تھا جو اس کی خوبصورتی سے محظوظ ہو رہا تھا۔

●●●

ہمارا اگلا پروگرام چھٹی والے دن ایکسپولینڈ (Expoland) جانے کا تھا۔ یہ میری یونیورسٹی کے قریب ہی تھا۔ جہاں EXPO 70 منعقد ہوئی تھی ایکسپولینڈ اسی جگہ بنایا گیا تھا۔

EXPO 70 ۱۹۷۰ عیسوی میں ہونے والی ایک بہت بڑی عالمی نمائش تھی جس نے جاپان کی صنعتی ترقی کے تعارف میں اہم کردار ادا کیا۔ نہ صرف صنعتی سٹال لگائے گئے بلکہ جاپانی ثقافت کو متعارف کرانے کے لئے باغات بھی بنائے گئے۔ کئی پاکستانی اور ہندوستانی فلموں کی شوٹنگ بھی EXPO 70 میں ہوئی۔ اور بھی ممالک نے اس جگہ سے فائدہ اٹھایا ہوگا۔

۲۰۰۷ عیسوی میں یہاں ایک حادثہ ہوا جس میں کئی لوگ ہلاک و زخمی ہوئے۔ اتنا ڈر

پھیلا کہ لوگوں نے ادھر آنا ترک کر دیا جس کی وجہ سے اسے ۲۰۰۹ عیسوی میں بند کرنا پڑا۔ مگر جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں، یہ اپنے عروج پر تھا۔ یہاں چالیس سے زیادہ تفریحات تھیں اور بیسیوں ریسٹورنٹ تھے۔

ایکسپو لینڈ جانے کے لئے ہم پھر سینٹری چوؤ گئے جہاں سے مونوریل (monorail) ایکسپو لینڈ تک جاتی تھی۔

مونوریل بھی حیرت انگیز چیز ہے۔ دیکھنے میں یہ عام ٹرین ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہ دو کی بجائے ایک پٹری پر چلتی ہے۔ جب یہ رفتار پکڑتی ہے تو ٹرین اور پٹری کا ملاپ ختم ہو جاتا ہے۔ ٹرین پٹری سے کچھ اوپر اٹھ جاتی ہے اور ہوا میں تیرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ یہ کرشمہ مقناطیسی قوت کی وجہ سے ممکن ہے۔ رگڑ نہ ہونے کی وجہ سے رفتار بڑھ جاتی ہے۔ اسی لئے دنیا کی تیز ترین ٹرینیں اسی اصول پر کام کرتی ہیں۔ مگر یہاں رفتار کا معاملہ نہیں تھا۔ اس ٹرین نے پلوں کے اوپر چلنا تھا اور شہر کے گنجان علاقے سے گزرنا تھا، شاید اس وجہ سے اسے عام ٹرین پر ترجیح دی گئی۔ یہاں یہ بتاتا چلوں کہ مونوریل غیر مقناطیسی بھی ہو سکتی ہے۔

•••

ایکسپو لینڈ میں داخل ہوتے ہی ہمیں ایک بہت بڑے ہاتھی کا سر نظر آیا۔ یہ دراصل آئس لینڈ کا صدر دروازہ تھا۔ غور سے دیکھنے پر پتہ چلتا تھا کہ یہ ہاتھی کے جدامجد میمتھ (mammoth) کا سر ہے جو دس ہزار سال پہلے تک کرہ ارض پر موجود تھا۔ اس کا جسم اور وزن ہاتھی سے بھی ڈیڑھ دو گنا زیادہ تھا اور اس کے جسم پر لمبے لمبے بال ہوتے تھے۔ دراصل اس کا دور وہی دور تھا جب اس دنیا پر برف راج کرتی تھی۔ اسے لئے اسے آئس لینڈ کے نشان کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو درجہ حرارت مصنوعی طور پر صفر کے قریب کیا گیا تھا۔ لگتا تھا کہ ہم اسی برفانی دور میں پہنچ گئے ہیں۔ وہاں سے ٹھٹھرتے ہوئے باہر نکلے تو horror land کا بورڈ دیکھا۔ ہمیں ایک گاڑی میں بٹھا دیا گیا جو پٹری پر چلتی ہمیں ایک سرنگ کے اندر لے گئی۔ کبھی تو کوئی کٹا ہوا سر ہمارا راستہ روکتا تو کہیں دائیں بائیں خطرناک قیدی نظر آتے جو تقریباً سلاخیں توڑ چکے ہوتے۔ لگتا کہ وہ ابھی حملہ آور ہو جائیں گے۔ پھر چلتے پھرتے مردے نظر آنے شروع ہو گئے جنہیں آج کی زبان میں zombie کہا جاتا ہے۔ مگر ان میں سے کسی چیز نے بھی ہمارے دل میں ڈر پیدا نہیں کیا۔

الف لیلہ کی کہانیوں نے عالمی شہرت حاصل کی ہے۔ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے تو یہ ہالی وڈ کی فلموں کا ایک پسندیدہ موضوع تھیں۔ یہاں بھی ان کا اثر دیکھا جب ایک اڑتا ہوا قالین نظر آیا۔ یہ دراصل ایک خطرناک جھولا تھا جس پر بیٹھنے کے لئے مضبوط اعصاب کی ضرورت تھی۔

آگے بڑھے تو ۳۰۰ فٹ اونچا فیرس وہیل تھا۔ رش تو کافی تھا مگر ٹکٹ آسانی سے مل گئے۔ اپنی انتہائی اونچائی پر یہ شہر کا بہترین نظارہ فراہم کرتا تھا۔ اس کا سائز اتنا بڑا تھا کہ دائرہ مکمل ہوتے چالیس منٹ لگ گئے۔

اب بات کرتے ہیں رولر کوسٹرز کی۔ یہ بھی کئی قسم کے تھے۔ کچھ میں تو بیٹھنے والے بالکل الٹے ہو جاتے تھے۔ مگر سب سے خطرناک سٹینڈنگ رولر کاسٹر تھا جو ڈیڑھ سو فٹ اونچا تھا اور وہاں سے اچانک تقریباً ۷۰ کے زاویے پر زمین کی سطح پر آ جاتا تھا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کا 'لطف' اُٹھانے والوں کو کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ بڑوں بڑوں کی چیخیں نکل جاتی تھیں۔ میری اہلیہ ڈاکٹر صالحہ اور بڑی بیٹی اسما نے ہمت دکھائی اور اس کا ٹکٹ خرید لیا۔ میں نے تصاویر بنانی تھیں اس لئے یہ شوق پورا نہ کر سکا۔ جب رولر کوسٹر نے غوطہ کھایا تو اسما کی عینک اتر گئی۔ وہاں کہاں ملنی تھی۔ مل بھی جاتی تو اصل حالت میں نہ ہوتی۔ جو بھی وہاں سے نکلتا اس کے ہوش اڑے ہوئے ہوتے۔

ایکسپو لینڈ میں باغبانی کے کمالات بھی ہر طرف نظر آ رہے تھے۔ پودوں کو مختلف جانوروں کی شکل میں تراشا گیا تھا اور جس حد تک ممکن تھا ایسے پودے اگائے گئے تھے جن کے پھول اس جانور کے قدرتی رنگوں سے قریب تر رنگت رکھتے ہوں۔

•••

ایکسپو لینڈ دراصل ایکسپو پارک کا ایک حصہ تھا۔ اس پارک کے بیچوں بیچ سو ڈیڑھ سو فٹ اونچا ٹاور آف سن (tower of sun) بنا ہوا تھا۔ جس کا رنگ سفید اور چہرہ سورج کی طرف تھا۔

اس ٹاور کے دوسری طرف جاپانی باغات تھے۔

جاپانی باغات کی تاریخ بڑی دلچسپ اور پیچیدہ ہے۔ فی الحال میں زین (zen) مندروں میں سفید بجری اور ریت سے بنے باغات کا ذکر نہیں کروں گا۔

جاپانی تاجر جب چین گئے تو کئی دوسری چیزوں کی طرح وہاں کے باغات سے بہت متاثر ہوئے اور وطن واپس آ کر نئے باغات بنائے۔ طریقہ کار تو چینی تھا مگر اسے دیسی رنگ دے

دیا گیا۔ان باغات میں مصنوعی پہاڑ، وادیاں، پہاڑی نالے، آبشاریں، جھیلیں، حتٰی کہ پتھروں سے بنے ساحل سمندر بھی شامل کر لئے گئے۔انہیں مزید خوبصورت بنانے کے لئے مختلف قسم کے پھول اور درخت لگائے گئے جن میں چاروں موسموں کی نمائندگی ہوتی تھی۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے اوراس میں مزید بہتری آتی جارہی ہے۔

ان باغات پر سب سے غالب فلسفہ شنتو (shinto) مذہب کا تھا جس میں آٹھ ہر لحاظ سے مکمل جزیروں اور دیوتاؤں کی جھیلوں کا ذکر ہے جنہیں شن چی (schin chi) کہا جاتا ہے۔

جاپانی باغات چینی دیومالا سے بھی متاثر ہوئے جس میں پانچ پہاڑی جزائر کا ذکر ہے جن پر آٹھ دیوتا رہتے تھے۔ یہ دیوتا ایک بگلے پر سوار ہوکر سفر کرتے جو ایک ہی اڑان میں انہیں منزلِ مقصود پر پہنچا دیتا۔ اس چینی دیومالا کے مطابق یہ پانچوں جزائر دراصل ایک بہت بڑے کچھوے کی کمر پر واقع تھے۔ یہ قصہ جاپان آیا تو ان پانچوں جزیروں کو اکٹھا کر کے ایک جزیرہ بنادیا گیا جسے ہورائی زین (horai zen) کہتے ہیں۔ اسے ایک ہر طرح سے مکمل دنیا کا نشان سمجھا جاتا ہے اور ہر جاپانی باغ میں اسے تعمیر کیا جاتا ہے۔اسی طرح کچھوؤں اور بگلوں کی نمائندگی کرتے چھوٹے چھوٹے پتھر بھی نظر آتے ہیں۔

ایکسپو پارک کے جاپانی باغات میں یہ سب کچھ تھا اور سکون اتنا کہ الفاظ میں بیان نہیں ہوسکتا۔اتنے خوبصورت مناظر تھے کہ ان کی تصویر کشی میری استعداد سے باہر ہے۔جگہ جگہ تالاب تھے جن میں بہت خوبصورت مچھلیوں کی کثیر تعداد تھی۔ ہم لوگ وہاں کئی بار گئے اور کئی کئی گھنٹے گزارے۔دھوپ ہو تو علیحدہ ماحول، بادل ہوں تو مناظر بالکل مختلف۔حتیٰ کہ بارش بھی بہت بھلی لگتی تھی۔اچھا خاصا ٹکٹ تھا مگر مفت معلوم ہوتا تھا۔کئی مقامات پر بہت دھیمے سروں میں موسیقی کی آواز بھی آتی رہتی تھی جو کانوں کو بھلی لگتی تھی۔

●●●

ایکسپو پارک میں نیشنل میوزیم آف ایتھنولوجی (National Museum of Ethnology) بھی تھا۔اس کا شمار جاپان کے اہم ترین میوزیم میں ہوتا ہے۔اس میں قدیم وجدید جاپانی معاشرے کے ہر شعبہ کو نمایاں کیا گیا ہے جس میں کھیتی باڑی، خوراک، ثقافت، شہری زندگی، مذہب، سب کچھ شامل ہے۔اس کے علاوہ ہر براعظم کے لئے علیحدہ حصہ ہے۔لگتا ہے آپ وہاں ہی جا پہنچے ہیں۔

ان میں بھی قدیم اور جدید زندگی کی نمائندگی ہے۔ پورے کے پورے گھر بنے ہوئے ہیں۔

اس میوزیم کی لائبریری کا شمار بھی جاپان کی بڑی لائبریریوں میں ہوتا ہے۔ اس میں دنیا کی تمام بڑی زبانوں کی کتب موجود ہیں۔ اس کے علاوہ یہ میوزیم ایک یونیورسٹی کے اشتراک سے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی دیتا ہے۔

اس میوزیم کو پوری طرح دیکھنے کے لئے کئی دن درکار ہیں۔ ہماری بھی کئی شامیں وہاں گزرتی رہیں۔ دوپہر کے بعد ہم جاپانی باغات میں چلے جاتے اور مغرب کے قریب میوزیم کا رخ کرتے۔

●●●

۴

جب ہم قریبی تفریحی مقامات دیکھ چکے تو اوساکا کے جنوبی علاقے کی طرف توجہ کی۔ اوساکا کا چڑیا گھر اور مشہور زمانہ ماہی خانہ (aquarium) وہیں تھے۔

تینو جی (Tennoji) چڑیا گھر کی اس وقت سب سے قابلِ ذکر چیز آسٹریلیا کا جانور koala bear تھا جو نیا نیا چڑیا گھر کی زینت بنا تھا۔ اسے دیکھنے کے لئے لمبی لائنیں لگی ہوئی تھیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، یہ چھوٹا سا معصوم بھولا بھالا جانور ہے جو نیم تاریک جنگلوں میں درختوں پر اپنی زندگی گزار دیتا ہے۔ اسے قدرتی ماحول فراہم کیا گیا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ غور سے دیکھنے پر ہی کسی قسمت والے کو درخت سے چمٹا نظر آتا تھا۔

اس کے علاوہ وہ تمام جانور تھے جو ہمارے چڑیا گھروں میں ملتے ہیں۔ ایسے جانور جو ہمارے ہاں نہیں ہوتے، ان میں برفانی ریچھ سب سے نمایاں تھا جسے پتھروں کو سفید رنگ کر کے دھوکا دیا گیا تھا۔ اس طرح کہ وہ برف کی سلیں معلوم ہوتی تھیں۔ جنگلہ کھلا تھا جس کا مطلب تھا کہ درجہ حرارت قطب شمالی والا نہیں ہو سکتا تھا۔ پتہ نہیں مصنوعی ماحول سے اسے کیا آسودگی حاصل ہوتی تھی۔ وہاں پینگوئن بھی تھے، یعنی قطب جنوبی کے مکین۔ میں نے ٹارچ کی روشنی ڈالی تو پورا غول کا غول اس کے پیچھے چل پڑا۔ کافی دیر یہ شغل چلتا رہا۔

وہیں جنوبی امریکہ کا اونٹ نما جانور لاما (lama) دیکھا۔ اس کی کوہان نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ دنیا کا سب سے بڑا اڑنے والا پرندہ کونڈور (condor) بھی تھا۔ یہ بھی جنوبی امریکہ کا

باسی ہے۔ وہاں امریکہ کا قومی نشان، سفید سر والا عقاب بھی تھا۔

●●●

اوساکا کا کائیوکان (kaiyukan) یعنی ماہی خانہ دنیا بھر میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں داخل ہوتے ہیں تو لگتا ہے کہ سمندر میں سفر کررہے ہیں۔ دائیں بائیں بڑے بڑے ٹینک (آبی ذخیرے) ہیں جن میں دنیا بھر کی آبی مخلوق ہے۔ کل ۱۶ ٹینک ہیں۔ سب سے بڑے ٹینک میں تقریباً دولاکھ مربع فٹ پانی ہے اور یہ وہیل شارک جیسی بڑی مچھلیوں کا مسکن ہے۔ اتنے پانی کو سنبھالنا کوئی آسان کام نہیں۔ ان ٹینکوں کی دیواریں acrylic glass سے بنی ہوئی ہیں اور موٹائی ایک فٹ ہے۔ عام شیشے کی اتنی موٹائی ہو تو دوسری طرف صاف نظر نہیں آتا۔ مگر acrylic glass بالکل شفاف ہوتا ہے اور اتنی موٹائی کا احساس تک نہیں ہوتا۔

وہیل شارک جیسی بڑی مچھلیوں کے علاوہ یہاں ہر قسم کے پینگوئن ہیں۔ ان میں emperor اور king پینگوئن بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ قابل ذکر آبی مخلوق میں دنیا کے سب سے بڑے سبز کچھوے، بہت بڑے کیکڑے، سمندری شیر اور الیکٹرک رے فش ہیں۔

●●●

یہ ماہی خانہ ساحل سمندر پر ہے۔ ہم وہاں سے فارغ ہوئے تو بندرگاہ کی سیر کو نکلے۔ وہاں بہت بڑے بڑے تجارتی جہاز کھڑے تھے۔ مگر جس جہاز نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا، اس کا نام سانتا ماریا (Santa Maria) تھا۔ یہ وہ جہاز تھا جس پر سفر کرتے ہوئے کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تھا۔ جو سانتا ماریا ہمارے سامنے تھا وہ اصل سے دوگنا بڑا تھا مگر تمام جزئیات اصل جیسی ہی تھیں۔ مستول اور بادبان بھی تھے مگر یہ نمائشی تھے۔ جہاز جدید تھا اور انجن کی طاقت پر چلتا تھا۔

یہ جہاز سیر و تفریح کے لئے تھا اور سمندر کی سیر کراتا تھا۔ ہم نے بھی ٹکٹ خریدے اور سوار ہو گئے۔ بیسیوں اور مسافر بھی تھے۔ میں تو پینٹ شرٹ میں تھا مگر خواتین کے پاکستانی لباس نے سب کو متوجہ کیا اور وہ اچانک VIP بن گئیں۔ ہر کوئی ان کے ساتھ تصویر کھنچوانے کا متمنی تھا۔ جس حد تک ممکن ہو سکا، لوگوں کی خواہش کو پورا کیا گیا۔ جہاز کے اندر کولمبس کا ایک مجسمہ تھا۔ لگتا تھا کہ وہ خود دورِ جدید میں آ کر ہمیں خوش آمدید کہہ رہا ہے۔

میرے علاوہ تمام اہلِ خانہ کا یہ سمندر کی سیر کا پہلا تجربہ تھا جس سے وہ بہت لطف اندوز

ہوئے۔ سورج ڈھل رہا تھا اور اس کی نقرئی کرنیں سمندر کی لہروں سے بغل گیر ہو کر ایک سحر انگیز منظر پیش کر رہی تھیں۔

سمندر سے ہمیں بے برج (bay bridge) بھی نظر آیا۔ اس کے علاوہ کنکریٹ کے بنے سات پل بھی تھے جو ایک دوسرے کو کراس کرتے تھے۔ یہ اس طرح ممکن تھا کہ یہ اوپر نیچے مختلف سطحوں پر تھے۔ یہ بل کھاتے ہوئے پل اس چیز کو یقینی بناتے تھے کہ ٹریفک کی روانی متاثر نہ ہو۔

•••

سماجی زندگی کے بغیر انسان ادھورا ہے۔ ہم نے اپنے گھر ڈاکٹر تبسم، ظفر اقبال بھٹی اور شفق اور اس کے اہلِ خانہ کو مختلف اوقات میں کھانے پر بلایا۔ بھٹی صاحب کا تعلق جھنگ سے ہے اور وہ اوساکا یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ اس سے پہلے وہ ترکی میں تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ وہ پاکستان واپسی کے کچھ ہی عرصہ بعد کینیڈا چلے گئے۔

ہمارے مہمانوں میں پروفیسر متسودا اور ان کی اہلیہ بھی شامل تھے۔ اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا تھا کہ کھانے میں مرچیں بہت کم ہوں۔ وہ دنیا کے مختلف ممالک میں رہ چکے تھے، اس لئے کھانے کے معاملے میں زیادہ حساس نہیں تھے۔ انہوں نے جی بھر کے کھانا کھایا۔ یہ ہمارے لئے اطمینان کا باعث تھا۔

کچھ عرصہ بعد پروفیسر متسودا نے ہمیں اپنے گھر کھانے پر بلالیا۔ وہ آٹھ دس مرلے کے گھر میں رہتے تھے جو جاپان کے حساب سے شاہانہ رہائش تھی۔ بہت خوبصورتی سے سجا ایک باغ بھی گھر کا حصہ تھا۔ ان کی پوری فیملی ہمارے استقبال کی منتظر تھی۔ اس میں ان کی دو بیٹیاں بھی شامل تھیں۔ ان کے دو بیٹے ٹوکیو میں تھے۔ یہ چاروں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

اس وقت تک میں نے بھی سیون کورس ڈنر کا نام نہیں سنا تھا۔ جب کسی کو بہت عزت دینی ہو تو اس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پہلے ایک دور چلتا ہے، پھر کچھ وقفے کے بعد دوسرا اور اس طرح سات دور ہوتے ہیں۔ واقف حال لوگ ہر ڈش میں سے تھوڑا سا چکھتے ہیں تاکہ آئندہ ادوار کے لئے پیٹ میں جگہ رہے۔ مگر ہم میں سے کوئی بھی واقف حال نہیں تھا۔

پہلے دور میں دو تین ڈشیں آئیں۔ ہم سمجھے کہ بس یہی سب کچھ ہے۔ سب نے پلیٹوں میں اچھا خاصا کھانا ڈال لیا۔ کچھ دیر کے بعد دوسرا راؤنڈ شروع ہوا۔ میں نے کنکھیوں سے اپنے

اہل خانہ کو کہا کہ کچھ نہ کچھ ڈالو۔ انہوں نے مجبوراً ایسا ہی کیا۔ میں نے بڑی چاہت دکھاتے ہوئے کچھ زیادہ ہی ڈال لیا اور یہ مرحلہ مکمل ہوا۔

ہمیں ابھی بھی اندازہ نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں سمجھا کہ اب آزمائش ختم ہو گئی۔ مگر پھر تیسرا، چوتھا اور اسی طرح ساتوں راؤنڈ آئے۔ میرے اہل خانہ نے بالکل ہاتھ اٹھا لئے مگر ایک مرد میدان آخر تک ڈٹا رہا۔ اس لئے کہ میز بانوں کی دل آزاری نہ ہو۔ غنیمت یہ تھی کہ کھانے اچھے بنے ہوئے تھے۔ مچھلی کا استعمال کافی زیادہ تھا۔

میز بانوں کو ساری صورتِ حال سمجھ آ رہی تھی۔ مگر انہوں نے پوری تیاری کی ہوئی تھی۔ اسے بیچ میں تو نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔

•••

میری چھوٹی بیٹی حنا اس وقت بچوں میں شمار ہوتی تھی۔ بچوں کا ریلوے ٹکٹ کم ہوتا تھا۔ مگر کم ٹکٹ لیتے ہوئے ایک بٹن جس پر 'بچہ' لکھا ہوتا تھا، دبانا ضروری تھا۔ حنا نے کسی سٹیشن پر خود ہی ٹکٹ لیا مگر 'بچہ' والا بٹن دبانا بھول گئی۔ منزلِ مقصود پر پہنچے تو ہم آگے تھے اور وہ پیچھے۔ ہم تو سٹیشن سے باہر نکل گئے مگر جب اس نے ٹکٹ مشین میں ڈالا تو راستہ نہ کھلا کیونکہ مشین کے مطابق پورے پیسے ادا نہیں ہوئے تھے۔ وہ گھبرا گئی اور رونا شروع کر دیا۔ سٹیشن کی حدود میں موجود سب مسافر ادھر متوجہ ہو گئے۔ مگر اس کی یہ پریشانی زیادہ دیر نہیں رہی۔ میں نے سٹیشن ماسٹر سے رابطہ کیا اور ساری صورتِ حال بتائی تو اس نے راستہ کھول دیا۔

•••

ہم لوگ اوسا کا اسلامک ایسوسی ایشن کے اجلاس میں بھی جاتے رہے۔ وہاں ایک پاکستانی خاتون آصفہ اتا کا سے ملاقات ہوئی جس کا شوہر جاپانی تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ اس خاتون کے شوہر نے اپنی بیوی کی خاطر جاپان چھوڑ دیا تھا اور اب یہ جوڑا کراچی میں رہتا تھا۔ اس خاتون نے پھولوں کی سجاوٹ کے جاپانی فن اکے بانا (ikebana) میں مہارت حاصل کر لی تھی اور پاکستان میں اس کی ترویج میں مصروف تھی۔

•••

۵

آئندہ صفحات میں جاپان کے اہم ترین قدیم شہروں نارااور کیوٹو کا بہت ذکر آئے گا۔ مناسب ہے کہ ان شہروں کا تعارف ہو جائے۔

نارا ۷۱۰ عیسوی سے ۷۹۴ عیسوی تک جاپان کا دارالخلافہ رہا۔ اگر چہ یہ اب ایک جدید شہر ہے مگر اس کا ماضی حال پر غالب ہے۔ ہر طرف مندر، مقابر اور کھنڈرات نظر آتے ہیں۔ ان میں سے آٹھ کو یونیسکو کی طرف سے عالمی تاریخی ورثہ (UNESCO world heritage) کا درجہ حاصل ہے۔

اس شہر کی خاص بات یہ ہے کہ ہر طرف جاپانی ہرن آزادانہ گھومتے نظر آتے ہیں۔ جاپانی دیومالا کے مطابق ایک دیوتا تاکے می کا زوچی (Takemikazuchi) نارا میں نئے بنے ہوئے دارالخلافہ کی حفاظت کے لیے ایک سفید ہرن پر بیٹھ کر آیا تھا۔ اس وقت سے ہرن کو ایک مقدس جانور سمجھا جاتا ہے جو شہر کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ یہاں آنے والے سیاح ان ہرنوں کو ایک خاص خوراک سیکا سین کی (sika senkei) کھلاتے ہیں جس کے سٹال ہر جگہ مل جاتے ہیں۔ یہ بسکٹ کی شکل میں ہوتی ہے اور ایک پیکٹ ۱۵۰ سے ۲۰۰ ین تک مل جاتا ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی میں جب بادشاہ کامو (Kamu) نے محسوس کیا کہ مذہبی پیشوا بہت طاقتور ہو گئے ہیں اور امور حکومت میں دخل اندازی کر رہے ہیں تو اس نے ایک نیا دارالخلافہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس کا نام ہیان کیو (Heian-kyo) رکھا گیا۔ دراصل یہ چین کی تانگ بادشاہت

کے دارالخلافہ کا عکس تھا مگر سائز میں چھوٹا تھا۔

۷۹۴عیسوی میں جاپانی تاریخ کے ہیان (Hiean) دور کا آغاز ہوا۔ گیارہویں صدی میں دارالخلافہ کے لئے چینی لفظ جنگ دو (jingdu) سے متاثر ہوکر اس شہر کا نام کیوٹو (Kyoto) رکھ دیا گیا۔ ۱۸۶۹عیسوی میں کیوٹو کی جگہ ٹوکیو دارالخلافہ بن گیا۔ سولہویں صدی کے آخر تک کیوٹو جاپان کا سب سے بڑا شہر تھا۔

دوسری جنگِ عظیم میں جاپان پر بے تحاشہ بمباری ہوئی جس سے قدیم عمارتوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا مگر کیوٹو عمومی طور پر بمباری سے بچا رہا۔ جب امریکہ نے جاپان پر ایٹم بم گرانے کا فیصلہ کیا تو کیوٹو کو ایک ہدف کے طور پر چنا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شہری آبادی کافی زیادہ تھی اور مشہور علمی شخصیات کی ایک بڑی تعداد اس شہر میں مقیم تھی۔ امریکیوں کا خیال تھا کہ اس شہر کی بربادی جاپان برداشت نہیں کرسکے گا اور ہتھیار ڈال دے گا مگر امریکی وزیر جنگ ہنری سٹم سن (Henry Stimson) نے مخالفت کی اور کیوٹو کی جگہ ناگاساکی کو ہدف چن لیا گیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کیوٹو میں بے شمار قدیم عمارات موجود ہیں۔ دو ہزار سے زیادہ تو عبادت گاہیں ہیں۔ اس کے علاوہ قدیم محلات اور باغات کی بھی ایک بڑی تعداد ہے۔

اس شہر میں سات منزل سے بلند عمارت بنانا ممنوع ہے۔ اس وجہ سے اس کی ثقافت پر جدیدیت کا رنگ نہیں چڑھا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ شہر جدید دور سے ہم آہنگ نہیں۔ اس کا جاپانی معیشت میں ایک اہم مقام ہے اور تعلیمی میدان میں بھی اس کا شمار جاپان کے بہترین شہروں میں ہوتا ہے۔ کیوٹو یونیورسٹی، ٹوکیو یونیورسٹی کے بعد جاپان کی سب سے مشہور درسگاہ ہے۔

نارا اوساکا کے جنوب مشرق اور کیوٹو شمال مشرق میں واقع ہے۔ دونوں جگہ پہنچنے کے لئے اوساکا سے عام ٹرین کا تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کا سفر ہے۔

●●●

اوساکا سے باہر ہمارا پہلا پروگرام نارا کا تھا۔ نارا ایک دن میں نہیں دیکھا جاسکتا۔ اس لئے سب سے پہلے وہاں کی مشہور ترین جگہ یعنی تودائی جی (Todaiji) جانے کا پروگرام بنا۔

اس جگہ بدھ مت کے کئی مندر ہیں مگر اس کی وجہ شہرت دنیا میں سب سے بڑا پیتل کا بنا ہوا مہاتما بدھ کا مجسمہ ہے جسے دائی بت سو (Daibutsu) کہتے ہیں۔ اس کی اونچائی پچاس فٹ

ہے۔ چونکہ یہ بیٹھی ہوئی حالت میں ہے، اس لئے اس کی چوڑائی اونچائی سے زیادہ ہے۔ یہ اسی فٹ چوڑا ہے اور اس کا وزن ۵۵۰ ٹن ہے۔ اسے ۷۲۸ عیسوی میں بنایا گیا۔ یہ کھلے آسمان کے نیچے نہیں۔ اسے ایک بہت بڑے ہال کے اندر رکھا گیا ہے جو آگ لگنے کی وجہ سے کئی دفعہ تعمیر ہوا۔ موجودہ عمارت ۱۷۰۹ عیسوی میں مکمل ہوئی۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس طرح لگائیے کہ اس عمارت کی لمبائی ۱۸۷ فٹ اور چوڑائی ۱۶۰ فٹ ہے۔ ۱۹۹۸ عیسوی تک یہ دنیا کی سب سے بڑی لکڑی کی بنی ہوئی عمارت تھی۔

اس عمارت کے باہر کھلے لان ہیں جن میں ہرن آزادانہ گھومتے ہیں۔

ہم جب اس کمپلیکس میں داخل ہوئے تو دو تین سو فٹ دور بڑی عمارت نظر آئی۔ اس کا رنگ گہرا بھورا تھا مگر درمیان میں لکڑی کے سفید پردوں نے بھی کافی جگہ گھیری ہوئی تھی۔

برآمدوں میں بڑے بڑے برتن تھے جن میں آگ جل رہی تھی اور لوگ اگر بتیاں جلا رہے تھے۔ مقدس مقامات پر اگر بتیاں جلانے کا رواج غالباً دنیا میں ہر جگہ ہے۔

تحریری پیمائشیں جو بھی ہوں جب آنکھ کسی چیز کا مشاہدہ کرتی ہے تو اصل حقیقت آشکار ہوتی ہے۔

جیسے ہی ہم اس عمارت میں داخل ہوئے تو مہاتمابدھ کے بت کی جسامت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس کا اندازہ اس طرح لگائیے کہ اس کے قریب پہنچ کر چہرہ دیکھنے کی کوشش میں پچھلی طرف گرنے کا احتمال تھا۔

جتنا یہ بت بڑا تھا اتنی ہی نفاست اور باریکی سے اس پر کام کیا گیا تھا۔ دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی اوپر کو اٹھی ہوئی تھی جو اس زمانے میں مستعمل کسی اشارے کو ظاہر کرتی تھی جو پیروکاروں کے لئے تھا۔ بائیں ہاتھ کی انگلیاں بھی ایک جگہ پر نہیں تھیں۔ چہرے پر بہت اطمینان اور محویت نمایاں تھی۔ لباس کی شکنیں بھی بالکل قدرتی لگ رہی تھیں۔

مہاتمابدھ کے اس بت کے گرد دو محافظ بھی بنے ہوئے تھے جن کا قد کاٹھ نسبتاً کافی چھوٹا تھا۔ اس عمارت میں اس طرح کے بت کئی اور جگہ بھی تھے۔

دہاں کچھ وقت گزارا مگر اہل خانہ کو زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے باہر آ گئے اور ہرنوں کی طرف دست دوستی بڑھانے کا سوچا۔ مگر اس کے لئے ضروری تھا کہ کوئی تحفہ پیش کیا جائے۔

انتظامیہ نے اس کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ کئی سٹال لگے ہوئے تھے جہاں سے ہرنوں کی پسندیدہ خوراک مل سکتی تھی۔

یہ ہرن خوب پلے ہوئے تھے۔ ان کا پیٹ تو کبھی کا بھر چکا تھا مگر نیت کبھی نہیں بھرتی تھی۔ ہم نے لالچ دیا تو پورا گروہ ہمارے پاس آ گیا۔ وہ بہت مانوس تھے۔ انہوں نے انسانوں کا اچھا روپ ہی دیکھا تھا۔ اس لئے کہ وہ مقدس تھے۔ انہوں نے بکریوں کی طرح خوب پیار لیا اور بے تکلف ہو کر ہمارے تحائف سے شکم پری کی۔

●●●

نارا میں دوسری قابل ذکر جگہ کاسوگا (Kasuga) مندر ہے۔ اس کا تعلق شنتو مذہب سے ہے۔ یہ جگہ قدرت سے بہت ہم آہنگ ہے۔ بہت وسیع پارک، گھنے درخت اور لاتعداد ہرن۔

یہ مندر بھی ۱۲۰۰ سال سے زیادہ پرانا ہے۔ یہ ۷۶۸ عیسوی میں تعمیر ہوا۔ اس مندر کے اندر بہت سی پیتل کی لالٹینیں ہیں۔ اس کے علاوہ پگڈنڈیوں کے ساتھ ساتھ ۳۰۰۰ سے زیادہ پتھر کی چوکیاں ہیں جہاں زمانہ قدیم میں دیے جلائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ لاتعداد مورتیاں بھی بنی ہوئی ہیں۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں میرا برازیلین دوست مورتیوں کی ہر زاویے سے تصاویر کھینچنے کے بعد پانی ڈال کر دوبارہ تصویریں کھینچتا تھا۔

مگر میرے اہل خانہ کی یہاں بھی زیادہ دلچسپی ہرنوں میں تھی۔ اس دفعہ وہ پوری تیاری کے ساتھ نارا جا رہے تھے۔ تیاری کا مطلب یہ کہ درجن بھر پراٹھے تیار کئے گئے تا کہ ہرنوں کو کھلائے جا سکیں۔

جب ہم ہرنوں کے پاس پہنچے تو انہوں نے ہماری آؤ بھگت توقع سے بھی زیادہ کی۔ ان کے لئے یہ بالکل نئی خوراک تھی۔ شاید انہوں نے اس سے پہلے ایسی مزیدار چیز نہیں کھائی تھی۔ ان کا بھی کوئی مواصلات کا نظام ہو گا۔ یہ خبر فوراً جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور پورے علاقے کے ہرن وہاں جمع ہو گئے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایک درجن پراٹھے بالکل ناکافی تھے۔ ایک انار سو بیمار والا معاملہ تھا۔

پہلے آؤ پہلے پاؤ کے اصول کے تحت اس دعوت کو تکمیل تک پہنچایا گیا۔

ہم ان راہداریوں پر چلتے ہوئے اور اس ماحول کا حصہ بنتے ہوئے وقت کی قید سے آزاد

ہو گئے ۔آج کے دور کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی سوائے ہمارے جیسے سیاحوں کے۔اتنا سکون تھا کہ بیان سے باہر ہے۔

وہیں ہمیں ایک قدیم درخت نظر آیا جو بالکل کھوکھلا ہو چکا تھا۔مگر چونکہ اس کی تاریخی اہمیت تھی،اس لئے اسے رسیوں کے سہارے کھڑا رکھا گیا تھا۔قریب ہی ایک ہرن کا بت بھی نظر آیا جس کے منہ میں سے ایک پائپ نکل رہا تھا جو صاف پانی فراہم کر رہا تھا۔

اسی جگہ ایک پرانا کنواں بھی تھا جس میں سے ایک بوڑھی عورت صدیوں پرانے طریقے سے پانی نکال رہی تھی۔ یہ عورت ان لوگوں میں سے تھی جنہوں نے جدید طرز زندگی کو بالکل ٹھکرا دیا ہے اور پرانے ماحول میں قدرت سے قریب تر ہو کر وقت گزارنے کو ترجیح دی ہے۔

•••

پروفیسر متسو دا نے مجھے ہوری او جی (Horyu-ji) مندر جانے کا مشورہ دیا۔انہوں نے بتایا کہ وہ دنیا کی سب سے پرانی لکڑی کی بنی عمارت ہے اور یونیسکو نے اسے عالمی ورثے کا درجہ دیا ہوا ہے۔کہا جاتا ہے کہ اس مندر کی تعمیر ۶۰۷ عیسوی،یعنی دور رسالت میں ہوئی۔

وہاں جانا چاہیے تھا مگر مشکل یہ تھی کہ اگر چہ یہ مندر نارا ضلع میں ہی تھا مگر نارا شہر سے دور تھا اور معروف راستوں سے ہٹ کر تھا۔مگر جب پروفیسر صاحب نے دو تین دفعہ پوچھا اور مجھے شرمندگی اٹھانی پڑی تو پھر ادھر کا رخ کرنا ہی پڑا۔

جس دن ہم یہ مندر دیکھنے گئے،شدید گرمی تھی۔ جاپان میں جولائی اگست میں گرمی پڑتی ہے جو بعض دفعہ نا قابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔اگر چہ درجہ حرارت ۳۵ ڈگری سے اوپر نہیں جاتا مگر جزیرے ہونے کی وجہ سے نمی کا تناسب ۱۰۰ فیصد ہوتا ہے۔اس وجہ سے پسینہ نہیں سوکھتا اور ٹھنڈک پیدا نہیں ہوتی۔

جب تک تو ہم ٹرین میں سفر کرتے رہے ائرکنڈیشن کی وجہ سے گرمی کا احساس نہیں ہوا مگر جب ٹرین سے باہر آئے اور ایک دو کلو میٹر پیدل چلنا پڑا تو برا حال ہو گیا۔ یہ مندر ایک گاؤں میں تھا۔ارد گرد دھان کے کھیت تھے جن سے نمی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

مندر میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ چھوٹا سا مندر تھا۔لکڑی بالکل کالی ہو چکی تھی۔چلیں پروفیسر صاحب کے حکم کی تعمیل تو ہو گئی۔

واپسی پر سب کے چہرے تانبے کی طرح سرخ ہو رہے تھے اور اسما اور حنا کو تو بخار بھی ہو گیا۔ خدا خدا کر کے ہم گھر پہنچے اور ائر کنڈیشن چلا کر فوراً بستروں پر ڈھیر ہو گئے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ایک گھنٹے میں ہی دونوں بیٹیوں کا بخار اتر گیا۔

●●●

۶

اب کیوٹو کا رخ کرتے ہیں۔

جیسا میں نے اس شہر کے تعارف میں لکھا، یہاں تاریخی مقامات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔اس کی وجہ اس شہر کا تقریباً ایک ہزار سال تک دارالخلافہ رہنا ہے۔

ان مقامات میں سب سے نمایاں اور مشہور Kinkakuji ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ یہ پورے جاپان کی سب سے مشہور تاریخی عمارت ہے۔اس کی وجہ اس کی تاریخی اہمیت نہیں، بلکہ اس کی خوبصورتی ہے۔ میری ذاتی رائے میں اگر جدید عمارات کو بھی شامل کر لیا جائے تو بھی جاپان میں سب سے خوبصورت یہی عمارت ہے۔

کن (kin) کا مطلب سونا ہے اور اس تین منزلہ عمارت کی اوپر والی دو منزلیں کاغذ جتنے موٹے سونے کے پرت سے ڈھکی ہوئی ہیں۔اسی لئے اسے گولڈن ٹیمپل (Golden Temple) بھی کہتے ہیں۔اس کی چھت پر تین چار فٹ اونچا سونے کا بنا بگلا ایستادہ ہے۔

اس مندر کا تعلق زین (zen) مذہب سے ہے۔اسے ۱۳۹۷ عیسوی میں تعمیر کیا گیا۔ بعد میں مختلف حوادث کی وجہ سے اس کی تعمیرِ نو ہوتی رہی۔اس عمارت کی اونچائی چالیس فٹ کے قریب ہے۔اس کی دیواروں پر جاپانی لے کر (lacquer) کرنے کے بعد سونے کا پرت چڑھایا گیا۔

اس عمارت کے اردگرد تالاب ہیں۔ جب سورج کی کرنیں سنہری عمارت پر پڑتی ہیں تو جو روشنی منعکس ہوتی ہے وہ تالاب اور آس پاس لگے پودوں اور درختوں کو ایک طلسماتی رنگ دیتی

ہے۔تالاب کی لہروں سے سونے سے ڈھکی ہوئی دیواروں پر بھی جھلمل ہوتی رہتی ہے۔ یہ منظر اتنا دلنشیں ہوتا ہے کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ہی اس کی داد کا حق ادا کیا جا سکتا ہے۔

اس مندر کی حدود میں جتنا بھی وقت گزاریں پتہ ہی نہیں چلتا۔اس کے ساتھ ہی ایک گھنا جنگل بھی ہے،جس کی اپنی الگ کشش ہے۔

یہاں ہر وقت لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔اگر لوگ کم ہوں تو اور لطف آئے مگر ایسا ممکن نہیں۔

•••

گولڈن ٹیمپل کو دیکھتے ہوئے تقریباً ایک صدی بعد اسی ڈیزائین پر ایک اور مندر بنایا گیا۔مگر شاید وسائل کی کمی کی وجہ سے اس پر سونے کی بجائے چاندی کے پرت چڑھانے کا ارادہ کیا گیا جو کبھی پورا نہ ہو سکا۔اسی نسبت سے اسے گن کا کو جی (Ginkakuji) یا سلور پویلین کہتے ہیں۔یہاں بھی وسیع رقبہ پر جنگل ہے،مگر اس کی اصل وجہ شہرت ریت کے باغات ہیں۔

جاپان میں ریت کے باغات کی روایت ہزار سال سے بھی پرانی ہے۔کئی دوسری چیزوں کی طرح یہ تصورات بھی چین سے آئے۔جاپانی سفید ریت اور بجری کو پاکیزگی کی نشانی سمجھتے ہیں۔

اگر کچھ بنیادی معلومات ہوں تو ان باغات میں سب کچھ نظر آ سکتا ہے۔شرط یہ ہے کہ جو جگہ انہیں دیکھنے لئے مقرر ہے وہیں سے دیکھا جائے۔

پہاڑ دکھانے کے لئے پتھروں کو لمبے رخ سیدھا کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ پہاڑی علاقہ دکھانا ہو تو انہیں پتھروں کو لٹا دیا جاتا ہے۔ندی نالے دکھانے کے لئے ریت بچھا دی جاتی ہے اور اس میں سیدھی لکیریں کھینچ دی جاتی ہیں جو بہتے پانی کو ظاہر کرتی ہیں۔اسی طرح سمندر دکھانے کے لئے وسیع جگہ میں یہ سفید ریت ڈال کر اسی طرح لکیریں ڈال دی جاتی ہیں۔طغیانی دکھانی مقصود ہو تو ان لکیروں کو لہرا کر کھینچا جاتا ہے۔ساحل سمندر کے لئے ریت پر ہلکے ہلکے نشان بنا دیے جاتے ہیں۔

ایک راہب ہر صبح اس باغ کی تمام علامتوں کو صحیح حالت میں لاتا ہے۔

گن کا کو جی میں یہ ریت کا باغ کافی بڑا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ اس میں ماؤنٹ

فیو جی (Mt.Fuji) کو دکھایا گیا ہے۔
ہم نے پورا ایک دن لگا کر ان دونوں جگہوں کی سیر کی اور لطف اندوز ہوئے۔ کن کا کو جی تو ہر کسی کو اپنی طرف کھینچتا ہے مگر ریت کے باغات کا فلسفہ سمجھانے میں مجھے کافی محنت کرنا پڑی۔

●●●

باغات کا ذکر چل رہا ہے تو مناسب ہے کہ کچھ الفاظ بون سائی (bonsai) کے بارے میں لکھ دیے جائیں۔ یہ چھوٹے سائز کے درخت اور پودے ہیں جواب پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ کچھ قسموں کے پودے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر انہیں ایک تنگ برتن میں اگایا جائے تو بونے ہو جاتے ہیں۔ یعنی ہر جز اپنی جگہ موجود مگر قد چھوٹا۔ انہیں خوبصورتی سے تراش کر آرائشی برتنوں میں رکھ دیا جاتا ہے۔
چھٹی صدی عیسوی میں زین مذہب کے جو راہب چین سے جاپان آئے وہ یہ فن ساتھ لے کر آئے۔
اب بونسائی کو عالمی مقبولیت حاصل ہے۔ اس پر ۱۲۰۰ سو سے زیادہ کتب لکھی جا چکی ہیں اور دنیا میں پچاس لاکھ سے زائد لوگوں نے اسے مشغلے کے طور پر اپنایا ہوا ہے۔

●●●

کیوٹو کے مغرب میں ایک تفریحی مقام اراشی یاما (Arashiyama) ہے۔ یہ چھوٹا سا قصبہ ہے مگر قدرتی حسن سے مالا مال ہے۔ قصبے کے درمیان میں ایک دریا بہتا ہے۔ چاروں طرف پہاڑ ہیں اور دنیا کے مشہور ترین بانس کے جنگلات میں سے ایک اسی قصبہ میں ہے۔
اوساکا سے اراشی یاما جانے کے لئے کیوٹو نہیں جانا پڑتا۔ راستے میں ہی ٹرین رخ بدل کر منزلِ مقصود تک لے جاتی ہے۔
ہم اراشی یاما پہنچے تو سٹیشن سے باہر نکلتے ہی دریا نظر آیا جو کافی چوڑا ہے۔ اس پر ایک پل بنا ہوا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ پل کے ایک طرف دریا کا نام اور ہے اور دوسری طرف اور۔
سیاحوں کو سیر کرانے کے لئے بہت سی ہتھ گاڑیاں بھی نظر آئیں مگر ہم نے پیدل ہی چلنے کا فیصلہ کیا۔ پل کے درمیان میں کھڑے ہو کر دریا اور اس کے پیچھے پہاڑوں کا نظارہ کیا۔ دوپہر ہو چکی تھی مگر پہاڑوں کے دامن میں دریا کے اوپر ابھی تک دھند چھائی ہوئی تھی۔ آسمان صاف تھا اور

دھوپ نکلی ہوئی تھی۔

دریا کے پار ہوئے تو قصبے کی گلیوں میں بے مقصد گھومنے لگے۔ وہاں کئی جگہ پر گھاس پھونس سے بنی چھتیں نظر آئیں۔ انہیں thatched roofs کہتے ہیں۔ کئی سالوں بعد انگلینڈ کے ساحلی قصبے ڈورسٹ (Dorset) میں بھی میں نے ایسے مکان دیکھے۔ وہاں مجھے ان چھتوں کی جو قیمت بتائی گئی وہ ہوشربا تھی۔ اب یہ نہیں پتہ کہ ان کا آغاز کہاں ہوا۔ مشرق میں کہ مغرب میں۔ مگر ایک بات یقینی ہے کہ گھاس پھونس سے بنی ہونے کے باوجود یہ غریب آدمی کی پہنچ سے باہر ہیں۔

تھوڑی دیر بعد ہم نے اپنی مٹرگشت میں کچھ مقصد پیدا کیا اور بانس کے جنگل کی تلاش شروع کر دی۔ اب موسم بہت گرم ہو گیا تھا۔ ہم بار بار ستانے کے لئے چھاؤں تلاش کرتے، پانی پیتے اور پھر چل پڑتے۔ ہم نے سوچا تھا کہ چھوٹا سا قصبہ ہے۔ آخر یہ جنگل کتنی دور ہوگا۔ مگر ہمیں وہاں پہنچنے میں ایک گھنٹہ سے زیادہ لگا۔

بانس کے جنگل میں پہنچتے ہی ہماری ساری تھکاوٹ دور ہو گئی۔ اس کے درمیان میں ایک شاندار پگڈنڈی بنی ہوئی تھی اور ستانے کے لئے کئی مقامات تھے۔ سبز رنگ کے بانس ہر طرف نظر آرہے تھے۔ کچھ موٹے تھے کچھ پتلے۔ اونچائی پچیس تیس فٹ ہوگی۔ یہ جنگل کافی گھنا تھا۔ اگر پگڈنڈی نہ ہوتی اور خود سے راستہ بنانا پڑتا تو بہت دشواری ہوتی۔

ایک ڈیڑھ گھنٹہ وہاں گزار کر واپسی کی ٹھانی۔ اب بھوک بھی خوب چمک رہی تھی۔ بہت تلاش کے بعد ایک ریسٹورنٹ ملا جہاں چاولوں کے ساتھ ٹماٹروں کی ایک ڈش ملا کر پیٹ بھرا۔

پل پر سے گذرتے ہوئے ہم کچھ دیر کے لئے رکے اور دوربین سے پہاڑوں کے دامن میں جو کہر تھا اس کے پار دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ ویران جگہ نہیں تھی۔ دریا کے کنارے کئی گھر نظر آرہے تھے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ بندروں کی ایک بہت بڑی تعداد تھی جو گھروں کے صحنوں میں گھوم رہے تھے۔ اتنی بڑی تعداد پالتو تو نہیں ہو سکتی۔ غالباً وہ گردونواح کے جنگلات سے آئے تھے اور شاید انہیں مقدس جان کر کچھ نہیں کہا جاتا تھا۔

دریا میں کئی موٹر بوٹس بھی نظر آئیں۔ دل للچایا کہ دریا کی سیر کی جائے مگر موسم گرم ہونے کی وجہ سے تھکاوٹ بہت ہو چکی تھی۔ عافیت اسی میں سمجھی کہ جلد از جلد گھر پہنچ کر آرام کیا جائے۔

●●●

۷

کوبے کو کیوٹو یا نارا جیسی تاریخی اہمیت حاصل نہیں مگر اس کا شمار جاپان کی مصروف ترین بندرگاہوں اور کاروباری مراکز میں ہوتا ہے۔

اس شہر کی پشت پر روکو (Rokko) پہاڑی سلسلہ ہے۔اس کی اونچائی تو ۳۰۰۰ فٹ تک ہی ہے مگر چونکہ یہ سمندر کے ساتھ ہی ہے، اس لئے کافی بلند لگتا ہے۔کوبے کے سامنے سمندر ہے۔

اس شہر میں ایک ہی مشہور مندر ہے۔اسے اکورا (Ikura) کہتے ہیں۔اس کی تاریخ کوبے شہر جتنی ہی پرانی ہے۔

اس شہر کی اہم ترین جگہ میریکن پارک (Merikan park) اور اس کے گردونواح کا علاقہ ہے۔اس کا اصل نام امریکن (American) پارک تھا جو بگڑ کر میریکن پارک بن گیا۔

میریکن پارک ساحل سمندر پر ہے۔اس کی سب سے نمایاں تعمیر کوبے پورٹ ٹاور (Kobe Port Tower) ہے جو ۳۴۵ فٹ اونچا ہے۔اس کی خاص بات اس کا ڈیزائن ہے جو جاپانی ڈرم تسوزومی (Tsuzumi) سے اخذ کیا گیا ہے۔اس کے اردگرد ۳۲ فولادی سلاخوں کا جال ہے جو جاپانی روایت کے مطابق ساحل پر آئے جہازوں کے استقبال کا انداز ہے۔اس کی چوٹی کی منزلوں میں ایک گھومتا کیفے ٹیریا بھی ہے۔

جب ہم عصر کے وقت میریکن پارک پہنچے تو اکا دکا لوگ ہی نظر آ رہے تھے۔کچھ لوگ سمندر اور اس میں آتے جاتے جہازوں کا نظارہ کر رہے تھے تو کچھ صرف چہل قدمی کے لئے آئے

ہوئے تھے۔

ہم ٹاور کی بالائی منزلوں سے غروب آفتاب کا نظارہ کرنا چاہتے تھے۔رش نہیں تھا اس لئے ٹکٹ لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ابھی سورج غروب ہونے میں تقریباً آدھ گھنٹہ باقی تھا۔اس جگہ دوربینیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ بہت اچھا منظر تھا۔ایک طرف سمندر دور تک دیکھا جا سکتا تھا تو دوسری طرف روکو پہاڑ کے دامن میں پھیلے کوبے شہر کا نظارہ تھا۔

کوبے کی جدید بلند عمارتیں زیادہ دور نہیں تھیں۔ان میں سب سے نمایاں اوکورا (Okura) ہوٹل تھا جو میریکن پارک کا ہی حصہ ہے۔اس کا علاوہ کئی عمارتیں شیشے کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھیں۔ یہ عمارتیں دیکھنے میں بہت خوبصورت لگتی ہیں اور شیشے کی وجہ سے اندرونی درجہ حرارت بھی معتدل رہتا ہے۔مگر یہ خطرناک بھی ہوسکتی ہیں۔

اوساکا میں ایک ایسی ہی عمارت تھی جو نعل کی شکل میں تھی۔گرمیوں میں ایک دن دوپہر کے وقت اس کے سامنے کھڑی ہوئی ایک موٹر سائیکل میں اچانک آگ بھڑک اٹھی۔ بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔نتیجہ یہی اخذ ہوا کہ اس عمارت نے آئینہ کا کام کیا اور سورج کی شعاعوں کو ایک ہی نقطہ پر منعکس کر دیا۔ یہ نقطہ وہ موٹر سائیکل تھا۔اتنی حرارت پیدا ہوئی کہ اسے آگ لگ گئی۔

ہم نے روکو پہاڑی سلسلے کے پیچھے غروب آفتاب کا نظارہ کیا اور واپس آ گئے۔

جیسے ہی ہم لفٹ سے باہر نکلے تو ایک عجیب منظر دیکھا۔ایک مشین تھی جس کی میز جیسی سطح پر کئی انسانی چہرے بنے ہوئے تھے۔ یہ بڑی عمر کے تھے اور ٹائی یا نک ٹائی بھی لگی ہوئی تھی۔چہروں پر بیزاری، تکبر اور نخوت نمایاں تھی۔ پاس ہی ایک مشین میں ہتھوڑے پڑے ہوئے تھے۔ پیسے ڈالنے سے ایک ہتھوڑا مل جاتا تھا۔ ہتھوڑا نکالیں اور جس بھی چہرے کی مشابہت آپ کے باس سے ہو اس پر برسانا شروع کر دیں۔ جتنی زور سے ہتھوڑا ماریں گے اتنے ہی زور سے باس کی چیخیں نکلیں گی۔اگر مقررہ وقت میں آپ کے دل کی بھڑاس نہیں نکلی تو اور پیسے خرچ کریں اور سلسلہ جاری رکھیں۔

اس مشین پر بہت رش تھا اور کئی نوجوان اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔دن بھر یا ہفتہ بھر یا مہینہ بھر وہ اپنے باس کی سختیوں کو برداشت کرتے رہے تھے اور اب اس کا حساب چکانا چاہتے تھے۔

ایسی مشینیں جاپان میں عام ہیں۔ دراصل یہ وہاں کے دفتری کلچر پر ایک چبھتا ہوا تبصرہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب اس صورت حال میں کافی بہتری آ چکی ہوگی۔ تبدیلی کے آثار اس وقت ہی نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔

ہم ٹاور کی حدود سے باہر نکلے تو میریکن پارک بہت خوبصورت نظر آ رہا تھا اور اس منظر میں سب سے نمایاں کوبے ٹاور ہی تھا جو اپنی سرخ اور زرد روشنیوں کی وجہ سے نگینے کی طرح جگمگا رہا تھا۔

•••

میریکن پارک کے نواح میں ہی کوبے ہاربر لینڈ (Kobe harborland) تھا۔ اس طرف نگاہ اٹھائی تو پندرہ بیس منزلہ اونچے دیو قامت بحری جہاز لنگر انداز نظر آئے۔ دوسری طرف نگاہ کی تو موتوماچی (Motomachi) تھا۔ یہ کوبے کا سب سے بڑا بازار ہے۔

ہم موتوماچی کی طرف جا رہے تھے تو ایک بہت بڑے بل بورڈ پر مونالیزا کی شبیہہ نظر آئی۔ وہ کچھ دیر کے لئے نظر آتی تھی پھر غائب ہو جاتی تھی۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ اس چہرے میں کیا دلکشی ہے۔ ایک موٹی، بھدی سی عورت کا چہرہ۔ یورپ والوں کی تو سمجھ آتی ہے کہ وہ اس کے خالق لیونارڈو ونچی کو پوجنے کی حد تک چاہتے ہیں مگر جاپانیوں کو کیا ہوا۔

موتوماچی ایک میل لمبا ہے۔ اوپر چھت اور دونوں طرف ہر قسم کی دوکانیں روشنیوں کے سیلاب میں نہائی ہوئی۔ روائتی جاپانی اشیا سے لے کر جدید ترین مغربی برآمدات تک، ہر چیز میسر۔ مگر ہم جیسے لوگ وہاں پر رونق میلہ دیکھنے یا ونڈو شاپنگ کرنے ہی جاتے ہیں۔ خریداری کے لئے بہتر اور سستے بازار موجود ہیں۔

کچھ قیمتوں کا ذکر دلچسپی کا باعث ہوگا۔ سبزیوں اور پھلوں کی قیمت ۳۰۰ سے ۱۰۰۰ ین تک۔ عورتوں کا عام کوٹ ۳۰۰۰۰ سے ۴۰۰۰۰ ین کے درمیان مگر فر کوٹ دس سے پندرہ لاکھ ین تک۔

جاپان کے ہر جدید بازار کی طرح وہاں پاچن کو (pachinko) کے اڈے بھی تھے۔ یہ جوئے کی ایک قسم ہے جو جاپانیوں کی ایجاد کردہ ہے۔ یہ خاص مشینیں ہوتی ہیں جن میں پیسے ڈالے جاتے ہیں اور قسمت آزمائی جاتی ہے۔ میں نے ان اڈوں کو ہمیشہ بھرا ہوا دیکھا۔

سستے بازاروں کا ذکر ہو تو ہم جیسے 'غریب غربا' کے لئے کو بے میں ایک بہت بڑی flea market ہے جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ یہ ریلوے اسٹیشن کے نیچے ہے اور اس کے سات حصے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ اس کی لمبائی دو میل کے قریب ہوگی۔ اس میں ہر قسم کی دوکانیں ہیں اور قیمتیں انتہائی معقول ہیں۔ بعض چیزیں اتنی سستی کہ یقین نہیں آتا۔ میں جب بھی کو بے جاتا وہاں کا چکر ضرور لگاتا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہاں ہر وقت بھیڑ لگی رہتی۔ کچھ دوکانیں ایسی ہوتیں جو سنسان رہتیں۔ ہم غیر ملکی ان میں داخل ہونے کی کوشش کرتے تو کوئی بوڑھی عورت یا مرد بجلی کی سی تیزی سے دروازے تک پہنچ جاتے اور 'دامے' چیختے۔ یعنی 'نہیں۔نہیں'۔ وہاں کیا کاروبار ہوتا تھا جو صرف جاپانیوں کے لئے مخصوص تھا، یہ معمہ ہی رہا۔ اگر وہ کھلے عام کاروبار کر رہے تھے اور حکومت روک ٹوک نہیں کر رہی تھی تو وہ کیا تھا جس کی پردہ داری تھی۔

●●●

ہم لوگوں نے موتو ماچی میں ایک گھنٹہ گزارا اور جب اپنی تنگ دامنی کا احساس حد سے تجاوز کر گیا تو باہر نکل آئے۔

چوک میں ایک گورا اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ پاؤں کی حرکت سے ڈرم بجتا، بایاں ہاتھ ہلانے سے طبلے کی آواز آتی۔ دائیں ہاتھ میں ہارمونیم تھا اور منہ سے بگل بجا رہا تھا۔ نیچے زمین پر ایک ڈبہ رکھا ہوا تھا جس میں لوگ اس کے فن کی داد دیتے ہوئے یا ازراہ ہمدردی پیسے ڈال دیتے تھے۔ اس شو سے کافی لوگ محظوظ ہو رہے تھے۔

یہ یورپی سیاحوں کا عام وتیرہ ہے۔ وہ اس طرح پیسے اکٹھے کرتے ہیں اور اگلی منزل تک پہنچنے کے لئے کافی رقم ہو جاتی ہے تو کوچ کرتے ہیں۔ یہ پیشہ ور بھکاری نہیں ہوتے بلکہ اس طریقہ کار کو ایک ایڈونچر سمجھتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔

قریب ہی ایک دست شناس نے اپنا اڈہ جمایا ہوا تھا اور وہاں پر نوجوان لڑکیوں کی بھیڑ تھی۔ زیادہ تر تو اسے تفریح کے طور پر ہی لے رہی تھیں۔ مگر شاید نہیں۔ اس لئے کہ وہ مفت میں ہاتھ نہیں دیکھ رہا تھا۔ دلچسپ بات یہ کہ وہ دست شناس آنے جانے والے مرد حضرات کی توجہ سے محروم تھا۔

●●●

موتو ماچی کے جنوب میں چائنا ٹاؤن ہے۔ یہ چائنا ٹاؤن دنیا کے ہر بڑے شہر میں ہیں۔ انہیں چینی تارکین وطن بناتے اور آباد کرتے ہیں۔ اس طرح وہ نہ صرف اپنی ثقافت کو زندہ رکھتے ہیں بلکہ کاروباری فوائد بھی حاصل کرتے ہیں۔

کوبے کا چائنا ٹاؤن کافی بڑا ہے اسے نان کن ماچی (Nankin machi) کہتے ہیں۔ اس میں سینکڑوں چینی ریسٹورنٹ اور دوکانیں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک چینی مندر بھی ہے۔

جیسے ہی ہم چائنا ٹاؤن میں داخل ہوئے تو پتہ چل گیا کہ یہ مختلف جگہ ہے۔ ایک بہت بڑی محراب نے ہمارا استقبال کیا جس کا سرخ رنگ اور اس پر بنے ہوئے اژدھے چینی ثقافت کا اعلان کرر ہے تھے۔

ذرا آگے گئے تو سڑک کے دونوں طرف بہت بڑی سرخ وسفید چینی لالٹین نظر آئیں جو کاغذ سے بنی ہوتی ہیں۔ ذرا آگے بڑھے تو پتھر سے بنے دو شیروں کا سامنا ہوا۔ اگر کسی کو اب تک یقین نہیں آیا تھا تو اب آ گیا کہ ہم چینی علاقہ میں داخل ہو چکے ہیں۔ سامنے ہی ایک بڑی سکرین پر چینی zodiac signs نظر آرہے تھے۔

یہاں ہمارے خریدنے والی کوئی چیز نہیں تھی۔ جو اشیا وہاں بک رہی تھیں ان کی افادیت یا تو چینی جانتے تھے یا وہاں جانے والے واقف حال لوگ۔ حتیٰ کہ وہاں ریسٹورنٹ بھی اجنبی تھے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ چینی ریسٹورنٹ دنیا میں ہر جگہ ہیں مگر ان کا مینو ہر ملک کے حساب سے مختلف ہوتا ہے۔ یعنی جو ڈشیں آپ کو پاکستان میں ملیں گی جاپان میں نہیں ہوں گی۔ یہ کاروبار ہے اور مقامی ذائقوں اور ترجیحات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

•••

روکو پہاڑوں کی اپنی کشش تھی۔ وہاں عموماً بادل رہتے تھے اور آتی جاتی کیبل کاریں اپنی طرف کھینچتی تھیں۔ سو ایک دن ہم وہاں بھی پہنچ گئے۔ جاپان میں موسم کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ ابھی دھوپ ہے تو دس پندرہ منٹ میں بادل آ جائیں گے۔ اس وجہ سے چھتری ہمیشہ ساتھ ہوتی ہے۔

اس دن بھی یہی ہوا۔ ہم اوساکا سے چلے تو آسمان بالکل صاف تھا مگر جب تک ہم روکو پہاڑوں کے دامن تک پہنچتے گہرے سیاہ بادل چھا گئے۔

ہم کیبل کار میں بیٹھے اور چوٹی کی طرف روانہ ہو گئے۔ ساتھ ہی بارش بھی شروع ہو گئی

اور اچانک موسم بھی سرد ہو گیا۔ جب ہم چوٹی پر پہنچے تو بارش رک گئی۔ بہت دلفریب موسم تھا۔ لگتا تھا کہ مری میں گھوم رہے ہیں۔ فرق یہ تھا کہ یہاں آبادی نہیں تھی۔ وہی لوگ تھے جو ہمارے ساتھ آئے تھے۔ ہمارے سامنے پورا کوبے شہر اور سمندر کا نظارہ تھا۔ آسمان پر بجلی لپک اور چمک رہی تھی۔ ساتھ ہی اس کا دھاڑنا تو لازمی تھا۔ مگر یہ سب ہمیں اچھا لگ رہا تھا۔ مگر کتنی دیر؟ شدید بارش شروع ہو گئی اور ہمیں پناہ لینی پڑی۔ جب دیکھا کہ موسم کے تیور ٹھیک نہیں ہوں گے تو واپسی کی ٹھانی۔

دوسری دفعہ ہم نے روکو پہاڑوں کا رخ کیا تو ظفر اقبال بھٹی صاحب کی فیملی بھی ساتھ تھی۔ اس دفعہ ہمارا ارادہ نونو بکی ہرب گارڈن (Nunobiki herb garden) جانے کا تھا۔ اس دن موسم صاف تھا اور صاف ہی رہا۔ یہ باغ روکو پہاڑوں کی چوٹی کی طرف جاتے ہوئے تقریباً نصف فاصلے پر ہے۔ اس میں دو سو قسم کے ۷۵۰۰ پودے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی گرین ہاؤس، ریسٹورنٹ اور کیفے بھی ہیں یعنی اس کی علمی اہمیت کے علاوہ یہ ایک مقبول پکنک سپاٹ بھی ہے۔

اس دن موسم صاف تھا اس لئے ہم نے وہاں تین چار گھنٹے گزارے۔ سمندر اور کوبے شہر کو دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔

●●●

کوبے سے پچیس تیس کلومیٹر دور سوما (Suma) ہے۔ یہ ساحل سمندر پر ایک تفریحی مقام ہے۔ جاپان میں ریت والے ساحل نہیں ہیں جو لوگوں کی توجہ کا مرکز بنیں۔

سوما میں ساحل سے تین چار سو گز دور سمندر میں ایک عمارت بنائی گئی ہے۔ ساحل سے اس عمارت تک جانے کے لیے ایک راستہ ہے جس کے دونوں طرف لوگ کانٹے ڈال کر مچھلی پکڑنے کا شوق پورا کرتے ہیں۔ اس عمارت میں ریسٹورنٹ اور گفٹ شاپس بھی ہیں۔ یہاں سے بحرالکاہل کا بہترین نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ واقعتاً یہ عظیم سمندر کاہل اور پرسکون ہے۔ کہیں کوئی شوریدہ لہر نظر نہیں آتی۔

اگر وقت کی کمی رکاوٹ نہ بنے تو سورج کی چال کے ساتھ سمندر کے بدلتے رنگوں سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔

●●●

دیارِ غیر میں وطن کی یاد زیادہ آتی ہے۔ ۱۴ اگست کو یوم آزادی ہم نے پورے اہتمام سے منایا۔ حنا اور اسما نے مل کر ایک بڑا جھنڈا اور کئی جھنڈیاں بنائیں اور گھر کو سجایا۔ شام کو ہم نے ہاؤس کیپر یوشیدا اور ایک پڑوسن فرانسیسی خاتون کو کھانے پر بلایا اور انہیں اپنے ملک کے بارے میں بتایا۔

یہ فرانسیسی خاتون بہت ملنسار تھی مگر اس کا خاوند کھلم کھلا متعصب شخص تھا۔ وہ میری اہلیہ اور بچوں کی اچھی دوست بن گئی۔ بعض دفعہ وہ اکٹھے شاپنگ کے لئے بھی نکل جاتے تھے۔

ایک دن وہ خاتون انہیں کوبے میں واقع ایک مشنری ہسپتال لے گئی۔ اس ہسپتال کا معیار دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوئے۔ جاپان میں مشنری اداروں کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ مغربی نو آبادیاتی طاقتیں جہاں بھی گئیں ان کے دو مقاصد تھے، تجارت اور عیسائیت کی تبلیغ۔ ہندوستان میں ۱۸۵۷ عیسوی کی جنگِ آزادی بھی بنیادی طور پر اسی تبلیغ کا ردِ عمل تھی۔

•••

۸

آخر وہ گھڑی آ پہنچی۔ یعنی میرے اہلِ خانہ کی واپسی کی گھڑی۔ وہ دس جون کو آئے تھے اور تیس اگست کو واپس جا رہے تھے۔ یہ اسی دن پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ خوشی کا وقت بہت تیزی سے گزرتا ہے۔ ایسی بے فکری کی زندگی پاکستان میں تو کبھی نہیں ملی تھی۔ میں اپنے ڈپارٹمنٹ جاتا ضرور تھا مگر کبھی جلدی آ جاتا یا کبھی چھٹی کر لیتا۔ کام کا کوئی دباؤ نہیں تھا۔ پروفیسر صاحب کی شفقت ہمیشہ میرے ساتھ تھی۔ وہ بھی صورتِ حال سمجھتے تھے اس لئے کبھی استفسار نہیں کیا۔

میرے اہلِ خانہ کے جذبات تو ملے جلے تھے مگر یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ملال کا عنصر غالب تھا۔ میرے دل میں تو ملال ہی ملال تھا جیسے وہ مجھے کسی قید خانے میں چھوڑ کر جا رہے ہوں۔

جب ان کی روانگی کا دن آیا تو یہ کیفیت اور شدت اختیار کر گئی۔ انہیں چیک ان کروانے کے بعد بھی میں ائرپورٹ پر ہی رکا رہا اور جب تک ان کا جہاز فضا میں بلند ہو کر نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا میں اسے تکتا رہا۔

بوجھل دل کے ساتھ واپس اپارٹمنٹ پہنچا مگر وہی جگہ جو کل تک بہت آرام دہ تھی اب آسیب زدہ معلوم ہونے لگی۔ اس کے سارے رنگ اور خوبصورتی ہوا میں تحلیل ہو گئی تھی۔ وہ ایک اجڑا دیار لگ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ ابھی دوسرے کمرے میں سے حنا یا اسما نکلیں گی اور کوئی مزیدار بات کرے گی یا باورچی خانہ میں صالحہ کوئی نئی ڈش بنانے میں مصروف ہو گی۔ مگر یہ اب کہاں؟ سب

واہمہ تھا۔

مجھ سے یہ صورتِ حال برداشت نہیں ہوسکی۔ اگر چہ میں اس اپارٹمنٹ میں آٹھ دس دن اور رہ سکتا تھا مگر میں نے اسے فوری طور پر خالی کردیا اور ہوسٹل میں چلا گیا۔ کم از کم وہاں لوگوں کی تعداد تو زیادہ تھی اور ماحول بھی مختلف تھا۔ مگر وہاں بھی مجھے نارمل ہوتے ہوئے کئی دن لگ گئے۔ جن تکلیف دہ تنہائی کے لمحات کا میں نے پچھلے صفحوں میں کہیں ذکر کیا تھا، وہ زیادہ تواتر سے آنے لگے۔

مجھے نارمل حالت میں لانے میں میرے چند دوستوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ اگلا سارا باب ان کے نام ہے۔

•••

باب پنجم
(اکتوبر۱۹۹۳تااپریل۱۹۹۵عیسوی)

۱

جب میں پہلی بار ۱۹۸۸عیسوی میں اوساکا آیا تھا تو سوائے ڈاکٹر تبسم کے کوئی پاکستانی نظر نہیں آتا تھا۔ کچھ تھے جو دو چار دنوں کے لئے آتے تھے تو ملاقات ہو جاتی تھی۔ مگر پانچ سال بعد یعنی ۱۹۹۳عیسوی میں صورتحال کافی تبدیل ہو چکی تھی۔ میرے اپنے کیمپس میں چار پاکستانی تھے۔۔۔نعیم رشید، محمد اشرف، نورالامین اور مسعود صدیقی۔ اس کے علاوہ تویونا کا (Toyonaka) کیمپس میں ظفر اقبال بھٹی صاحب تھے جن سے مہینے میں ایک آدھ بار ملاقات ہو جاتی تھی۔ ڈاکٹر تبسم سے بھی گاہے گاہے ملاقات رہتی تھی۔

•••

جن دوستوں سے میرا روز کا ملنا تھا ان میں سرفہرست لاہور کے نعیم رشید تھے جو اب ماشاءاللہ پروفیسر ڈاکٹر نعیم رشید ہیں اور پنجاب یونیورسٹی کے ذیلی ادارے سکول آف بیالوجیکل سائنسز (SBS) کے ڈائریکٹر جنرل ہیں۔ ان سے اب بھی رابطہ رہتا ہے۔ میں جب بھی لاہور جاتا ہوں تو سب سے پہلے ان سے ملتا ہوں۔ اسی طرح جب وہ فیصل آباد آتے ہیں تو شرف ملاقات ضرور بخشتے ہیں۔ وہ دراز قد ہیں اور پتلا جسم رکھتے ہیں۔ جیسے وہ بیس سال پہلے تھے اب بھی ویسے ہی ہیں سوائے اس کے کہ بالوں میں کچھ چاندی جھلکنے لگی ہے۔
عمر میں مجھ سے آٹھ دس سال چھوٹے ہیں مگر کبھی یہ فرق محسوس نہیں ہوا۔ میں نے ان جیسا تحمل مزاج، خوش گفتار اور دھیمے لہجے میں بات کرنے والا شاید ہی کوئی شخص دیکھا ہو۔ اس کے

علاوہ میں نے انہیں ہمیشہ ہر حال میں مطمئن دیکھا۔

وہ پہلی بار اکتوبر ۱۹۹۳ عیسوی میں ایک سال کے لئے جاپان آئے تھے۔ ان کا پروفیسر اتنا متاثر ہوا کہ جاپانی گورنمنٹ کا سکولر شپ دلوا دیا۔ اس طرح وہ جنوری ۱۹۹۵ عیسوی میں دوبارہ پی ایچ ڈی کے لئے جاپان آ گئے۔

میری طرح فوٹو گرافی اور سیر و تفریح کے وہ بھی بہت شوقین ہیں۔ ہفتہ اتوار دو چھٹیاں ہوتی تھیں۔ عام طور پر ہفتہ کے دن ہم کہیں سیر سپاٹے کے لئے نکل جاتے۔ اکثر اوقات کچھ اور دوست بھی شامل ہو جاتے۔

ان کا مشاہدہ بہت گہرا ہے اور راہ چلتے وہ کسی ایسی چیز کو نوٹ کر لیتے جس پر ہماری توجہ نہ جاتی۔ نعیم کی طبیعت میں سادگی بھی بہت ہے۔ اتنے بڑے عہدے پر ہونے کے باوجود میں نے انہیں کبھی کبھار ہی ٹائی سوٹ میں دیکھا ہے۔

اس کے علاوہ وہ صرف اس لئے کہ دوسرے کی دلآزاری نہ ہو، بعض دفعہ کسی ایسے عمل کا حصہ بن جاتے ہیں جس سے دراصل انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ ہم منامی سینٹری پارک سے گزر رہے تھے۔ ایک بوڑھی جاپانی عورت راہ چلتوں کو بلا بلا کر ان کے ہاتھ دیکھ رہی تھی۔ اس نے ہمیں بھی اپنی طرف متوجہ کیا۔ کسی نے توجہ نہ دی مگر نعیم صاحب یہ کہہ کر اس کی طرف چل پڑے کہ یار چلو اس طرح وہ خوش ہو جائیگی۔ واقعتاً وہ عورت بہت خوش ہوئی کہ ایک غیر ملکی اس کو اہمیت دے رہا تھا۔ دو چار منٹ کے اس سیشن میں وہ جو بتاتی رہی وہ اس طرح سنتے رہے کہ جیسے ہر چیز سمجھ میں آ گئی۔ ظاہر ہے سمجھ کیا آنا تھا۔ ان کی جاپانی زبان پر گرفت میری طرح واجبی سی ہی ہے۔

وہ پی ایچ ڈی کے بعد کیوٹو یونیورسٹی میں چار پانچ سال بطور سائنسدان کام کرتے رہے۔

•••

اب کچھ ذکر لاہور ہی کے اشرف صاحب کا ہو جائے۔ وہ پاکستانی گورنمنٹ کے سکولر شپ پر آئے ہوئے تھے۔ بے نظیر کی حکومت تھی۔ ایک دفعہ اس نے سکولر شپ بھیجنے بند کر دیے جس کی وجہ سے اشرف صاحب کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ سال پہلے پیپلز پارٹی کی

حکومت نے پھر یہ حرکت کی۔ نہ جانے یہ کیوں نہیں سوچا جاتا کہ اتنی معمولی سی رقم بند کرنے سے گورنمنٹ کو شاید کوئی فائدہ ہوتا ہو یا نہ ہو، بیرون ملک پاکستانی ایک اخباری اطلاع کے مطابق بعض دفعہ بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ کتنی ذلت آمیز چیز ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔

اشرف صاحب کا ذکر ہو تو ابتدا اسی واقعہ سے ہوگی جو انہیں جاپان پہنچتے ہی پیش آیا۔

ہوا یہ کہ وہ رات کے وقت اوساکا پہنچے۔ ٹیکسی ڈرائیور کو لکھا ہوا پتہ تھمایا اور وہ انہیں منزل مقصود تک لے گیا۔ جس گلی میں ان کا ہوسٹل تھا اس کے موڑ پر ۳۰ لکھا ہوا تھا۔ انہیں نے یہ ہندسہ ذہن نشین کر لیا کہ ہوسٹل ڈھونڈنے میں آسانی رہے گی۔

اگلے دن شام کے وقت ہوسٹل آنے کے لئے پھر ٹیکسی لی اور علاقہ بتا دیا۔ وہ مطمئن تھے کہ گلی نمبر تو یاد ہے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ صورتِ حال یہ بنی کہ ہر گلی کے موڑ پر ۳۰ لکھا نظر آیا۔ جاپانی زبان آتی نہیں تھی کہ ڈرائیور کو کچھ بتا سکیں۔ موبائل کا ابھی دور نہیں آیا تھا نہ ان کی کسی سے شناسائی تھی۔ کتنی دیر تک ٹیکسی ڈرائیور ساتھ دیتا؟ آخر کار اس نے شکریہ کہا اور اپنے پیسے لے کر چلتا بنا۔

وہ رات اشرف صاحب کو فٹ پاتھ پر گزارنی پڑی۔ بات یہ تھی کہ ۳۰ کا ہندسہ رفتار کی حد کو ظاہر کر رہا تھا اس لئے وہ ہر جگہ نظر آ رہا تھا۔

اشرف صاحب کا سوچنے کا انداز جداگانہ تھا۔ پی ایچ ڈی کے بعد پاکستان آ کر انہوں نے کوئی سرکاری نوکری نہیں کی حالانکہ اس وقت بہترین مواقع میسر تھے۔ جاپان میں بھی کبھی ان کا موڈ ہوتا تو ہمارے ساتھ شامل ہو جاتے ورنہ صاف انکار کر دیتے۔

نعیم کی طرح انہیں بھی فوٹوگرافی کا بہت شوق تھا اگرچہ ان کے پاس وہ قیمتی کیمرے اور لینز نہیں تھے جو ہر وقت نعیم کے پاس ہوتے۔ دونوں کا پسندیدہ مشغلہ پھولوں کی تصویر کشی تھا۔ بعض دفعہ تو وہ مرجھائے ہوئے پھولوں کو بھی نہیں بخشتے تھے۔

دو تین سال پہلے ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ لاہور کے نواح میں اپنا طبی ادارہ چلا رہے ہیں۔

•••

نورالامین صاحب پٹھان تھے۔ ان کے آبائی علاقہ کا کچھ یاد نہیں۔ وہ فوج میں انجینئرز کو پڑھاتے تھے۔ سب پٹھانوں کی طرح زندہ دل اور زود رنج تھے۔ مگر دل کے صاف

اور بہت دلچسپ شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے جلد ہی جاپانی زبان پر عبور حاصل کرلیا جس کا ان کے علاوہ ہم سب کو فائدہ پہنچتا تھا۔ ایک واقعہ تو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

اشرف صاحب نے پاکستان جانا تھا۔ پہلے اوساکا سے ٹوکیو اور پھر ٹوکیو سے لاہور۔ انہوں نے الارم لگا دیا اور سو گئے۔ جب ہم انہیں الوداع کہنے پہنچے تو موصوف ابھی سو رہے تھے۔ ہڑ بڑا کر اٹھے تو پتہ چلا کہ فلائٹ میں ایک گھنٹہ رہ گیا ہے۔ ابھی انہوں نے سامان بھی پیک کرنا تھا اور تیار بھی ہونا تھا۔ اس کے علاوہ ائرپورٹ پہنچنے میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ لگتا تھا۔ مختصراً یہ کہ کوئی امید نہیں تھی کہ وہ پاکستان جا سکیں۔

مگر خان صاحب ہمت ہارنے والے نہیں تھے۔ اشرف صاحب سے کہنے لگے:

'یار، ائرپورٹ تک تو پہنچو شاید کوئی صورت نکل آئے۔'

ہم نے اشرف صاحب کے ساتھ مل کر سامان پیک کیا۔ جب وہ تیار ہوئے تو اس وقت تک ان کا جہاز ٹیک آف کر چکا تھا۔ خان صاحب انہیں زبردستی ٹیکسی میں بٹھا کر ائرپورٹ لے گئے۔ جس جہاز پر اشرف صاحب نے جانا تھا وہ جاپان ائرلائن (JAL) کا تھا۔ وہ تو نکل گیا تھا مگر جب یہ ائرپورٹ پہنچے تو آل نپان ائرلائن (ANA) کی فلائٹ تیار تھی۔ نہ جانے خان صاحب نے کیا جادو کیا اور کس طرح عملے کو قائل کیا۔ شاید کوئی بہت دردناک کہانی سنائی ہو۔ مختصراً یہ کہ وہ JAL کے ٹکٹ پر اشرف کو ANA کے جہاز پر بٹھانے میں کامیاب ہو گئے۔ چونکہ ٹوکیو سے پی آئی اے کی فلائٹ کافی دیر سے تھی اس لئے اشرف صاحب پروگرام کے مطابق پاکستان چلے گئے۔

نہ جانے کہاں سے خان صاحب کو یہ وہم ہو گیا تھا کہ انہیں کینسر ہے۔ پہلے تو ہم یہی سمجھتے رہے کہ وہ یہ بات سنجیدگی سے نہیں کرتے مگر جلد ہی احساس ہو گیا کہ وہ بے حد سنجیدہ ہیں۔ میں نے انہیں بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر خدانخواستہ کسی کو یہ بیماری ہو تو کوئی نہ کوئی علامت تو ضرور ہوتی ہے اور جتنی دیر سے وہ شور مچا رہے ہیں کچھ نہ کچھ ضرور سامنے آ جاتا۔ مگر ان کی تسلی نہیں ہوئی۔

خان صاحب سب سے آخر میں اوساکا یونیورسٹی سے فارغ ہوئے۔ مگر نہ نعیم کو نہ اشرف کو بلکہ کسی کو بھی ان کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ اگر کسی طرح یہ کتاب ان تک پہنچے (جس کا

امکان بہت کم ہے) تو ان سے گذارش ہے کہ رابطہ کریں۔

●●●

مسعود صدیقی صاحب کا تعلق کوئٹہ سے تھا۔ وہ بہت خاموش طبع تھے مگر ایک مسکراہٹ ہر وقت ان کے چہرے پر کھیلتی رہتی تھی۔ وہ ہمارے سیر و تفریح کے پروگرام کا باقاعدہ حصہ ہوتے تھے مگر بات ذرا کم ہی کرتے تھے۔ وہ اب بھی کوئٹہ ہی میں ہیں۔ چند سال پہلے ان سے رابطہ ہوا پھر یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ مگر نعیم سے ان کی گپ شپ رہتی ہے۔

●●●

۲

میرے ڈیپارٹمنٹ میں کافی تبدیلیاں آچکی تھیں۔چینی جوڑا، ما،اور ہارادا جا چکے تھے۔

نئے آنے والوں میں الجزائر کی پروفیسر صفیہ، پیراگوائے کی نورما اور بولیویا کے بوگاڈو تھے۔

پروفیسر صفیہ اپنے ملک میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھی اور اس کی وہ افسرانہ شان یہاں بھی برقرار تھی۔ نہ اس کا کام سیکھنے کا مزاج تھا نہ ہی ارادہ۔ تبصرے بہت کرتی تھی۔ کہنے کو تو مسلمان تھی مگر انتہائی آزادانہ خیالات رکھتی تھی۔ بہت ہی واجبی شکل صورت نے اس کے بال و پر کاٹ رکھے تھے۔

نورما اور بوگاڈو تمام لاطینی امریکنوں کی طرح کھلے دل کے ہر وقت خوش رہنے والے لوگ تھے۔انہیں، خاص طور پر بوگاڈو کو ہر وقت کسی ہنگامے کی تلاش رہتی تھی۔ وہ کسی بڑے مقصد یعنی پی ایچ ڈی وغیرہ کے لئے نہیں آئے تھے،اس لئے خوش باشی سے اپنا وقت گزارر ہے تھے۔

•••

پروفیسر صاحبان سے اب تقریباً برابری کا رشتہ تھا۔ بلکہ بہتر ہے کہ یہ کہوں کہ وہ مجھے اپنے میں ہی سے سمجھتے تھے۔علمی کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی گپ شپ رہتی۔

ایک دن میرے ہاتھ پر چوٹ لگ گئی اور میں نے پٹی باندھ لی۔

پروفیسر متسودا کہنے لگے:

'کیا تمہارے پاس گنگا جل نہیں، وہ لگا لیتے۔'

میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی کہانی سنانے کے موڈ میں ہیں۔

میں نے کہا:

'گنگا تو ہندوستان میں ہے۔'

پھر انہوں نے وہ واقعہ سنایا جو وہ سنانا چاہتے تھے۔

کہنے لگے:

'تمہارے آنے سے ایک سال پہلے ہندوستان سے ایک طالب علم آیا تھا۔ اس کے ماتھے پر چوٹ لگ گئی۔ میں نے اسے دوا لگانے کی پیش کش کی مگر وہ انکاری ہو گیا۔ کہنے لگا کہ وہ اپنے ساتھ لایا گنگا جل ہی لگائے گا۔ چونکہ عقیدے کا معاملہ تھا اس لئے میں چپ ہو گیا۔ دو تین دن میں اس کا زخم خراب ہو گیا اور اس میں پیپ پڑ گئی۔ ساتھ ہی تیز بخار ہو گیا۔ میرے بار بار کہنے کے باوجود وہ گنگا جل لگانے پر بضد رہا۔ آخر مجھے سختی کرنی پڑی۔ جب مناسب علاج ہوا تو وہ ٹھیک ہو گیا۔'

اس قسم کی اندھی عقیدت کے واقعات ہمارے ہاں بھی بکثرت ملتے ہیں۔

•••

پروفیسر سوگی موتو کے موضوعات زیادہ سنجیدہ ہوتے تھے۔ وہ جاپانی طرز زندگی سے زیادہ خوش نہیں تھے۔ انہیں یکسانیت سے شکایت تھی۔ ایک ہی جیسی عمارات، ایک ہی جیسا ماحول اور ایک ہی جیسے لوگ۔ زندگی بہت خوش حال تھی مگر متنوع نہیں تھی۔

اسی موضوع کو آگے بڑھائیں تو سکینڈے نیوین ممالک ترقی کی معراج پر پہنچے ہوئے ہیں۔ ہر ضرورت زندگی وافر مقدار میں میسر ہے۔ سماجی انصاف ہے، کوئی اونچ نیچ نہیں۔ وہاں عمریں بھی بہت لمبی ہیں۔ مگر وہ لوگ بوریت کا شکار ہیں۔ جب سب کچھ حاصل ہو جائے تو سوال سامنے آتا ہے 'اب کیا؟' اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں۔ جدوجہد کرنے کے لئے کوئی میدان باقی نہیں بچا۔ اس وجہ سے وہاں شرح خودکشی بھی سب سے زیادہ ہے۔

پروفیسر سوگی موتو موسیقی کے بھی شوقین تھے اور استاد نصرت فتح علی خان کے مداح تھے۔ استاد نصرت فتح علی خان پوری دنیا میں مقبول ہیں۔ میں امریکہ گیا تو وہاں بھی ہر جگہ ان کے کیسٹ دیکھے۔ جاپانیوں کی عقیدت کی ایک اور وجہ ان کے چہرے کے خدوخال ہیں جو جاپانیوں

سے ملتے ہیں اور ان میں انہیں اپنے کسی دیوتا کی جھلک نظر آتی ہے۔

ایک دن بوگاڈو مجھے کہنے لگا کہ چلو فلم دیکھنے چلیں۔ چنانچہ ہم (last temptation of Christ) دیکھنے چلے گئے۔ یہ وہی فلم ہے جس میں استاد نصرت فتح علی خان کا الاپ شامل کیا گیا اور اس طرح ان کی بین الاقوامی شہرت کا آغاز ہوا۔

ہم فلم دیکھنے پہنچے تو پتہ چلا کہ آدھی فلم گزر گئی ہے۔ ٹکٹ دینے والے کلرک کے بقول یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ہم شو ختم ہونے پر بیٹھے رہیں اور جو حصہ نہیں دیکھ سکے، اگلے شو میں دیکھ لیں۔ وہاں یہی دستور ہے۔ سارا دن فلم چلتی رہتی ہے اور لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔

•••

ہوسٹل کی زندگی میں بڑا ٹھہراؤ تھا۔ میری زیادہ دوستی ایک انڈونیشی سے تھی۔ وہ عام انڈونیشی لوگوں کے برعکس دراز قد اور موٹا تھا۔ نام تو اس کا جمال الدین تھا مگر میں اسے ہمیشہ 'ہاتھی میرا ساتھی' کہہ کر بلاتا تھا۔ وہ فوراً سمجھ جاتا کہ اسے بلایا ہے اور ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل جاتی۔ میں اللہ تعالےٰ سے دعا مانگتا رہتا کہ کہیں اسے مطلب کا نہ پتہ چل جائے۔

اس کے علاوہ دو چار یورپین اور امریکن تھے مگر نوے فیصد چینی تھے۔ میرا یہ مشاہدہ تھا کہ وہ بہت تیز طرار تھے اور جاپانی اور کورین لوگوں کی نسبت ان میں چالاکی بہت تھی۔ ان میں سے کچھ ناپسندیدہ حرکات میں بھی ملوث ہوتے تھے اور ان کا رویہ بہت جارحانہ ہوتا تھا۔ خاص طور پر یہ ان کے لئے ناقابلِ برداشت تھا کہ کوئی چینی لڑکی کسی اور قومیت کے شخص سے دوستی کرے۔ لگتا تھا جیسے وہ کہہ رہے ہوں 'کیا ہم مر گئے ہیں؟'

مگر چینی طلبا پاکستانیوں کے ساتھ سب بہت اچھی طرح ملتے تھے اور کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔

•••

اوساکا میں برفباری کبھی کبھار ہوتی تھے۔ اصل مسئلہ بہت ٹھنڈی تیز ہوائیں تھیں جو سردیوں میں ہر وقت چلتی رہتی تھیں۔ ایک دن میں صبح اٹھا اور تیار ہو کر باہر نکلا تو ہر طرف برف ہی برف تھی بلکہ اس وقت بھی برف باری پورے زور شور سے جاری تھی۔ میں نے 'ہاتھی میرے ساتھی' کو بلایا اور ہم بچوں کی طرح ایک دوسرے پر برف کے گولے پھینک کر بہت لطف اندوز ہوئے۔

اتنی شدید برف باری کو ہوتے ہوئے دیکھنا میرے لئے نیا تجربہ تھا۔'ہاتھی میرے ساتھی' کے لئے تو یہ ناقابل تصور منظر تھا۔انڈونیشیا میں تو سردیاں ہوتی ہی نہیں اور وہ گرم کپڑوں سے بے نیاز رہتے ہیں۔

یونیورسٹی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا کہ کئی جگہ پر لوگوں نے سنومین بنائے ہوئے تھے۔موسم صاف ہونے کے باوجود یہ سنومین تین چار دن اپنی اصل حالت پر قائم رہے۔اس کی وجہ برفانی ہوائیں تھیں جو دن کے وقت دھوپ کے باوجود درجہ حرارت صفر کے قریب رکھتی تھیں۔

●●●

۳

کیوٹو کا ذکر ہی اے (Hiei) پہاڑ کے بغیر نامکمل رہتا ہے۔ شمال مشرق میں واقع یہ پہاڑ کیوٹو کو گھیرے ہوئے پہاڑوں میں سب سے بلند ہے۔ یہ سیر و تفریح کے لئے بھی ایک بہترین جگہ ہے اور بدھ مت کے پیروکاروں کے لئے اس کی مذہبی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

اس کی چوٹی پر بنا ایک مندر این راکو جی (Enrakuji) ۷۸۸ عیسوی میں تعمیر ہوا۔ اس پہاڑ کا ذکر کئی لوک داستانوں میں ملتا ہے اور اسے دیوتاؤں اور شیطانوں کا مسکن بھی سمجھا جاتا رہا ہے۔

این راکو جی مندر کے راہب روحانی روشنی حاصل کرنے کے لئے ناقابل یقین وظیفے کرتے ہیں ان میں سے ایک وظیفہ مسلسل سو دن تک ہر روز ۵۲ میل چلنا ہے۔

●●●

یہ جگہ میرے پسندیدہ ترین تفریحی مقامات میں سے تھی اور میں یہاں اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ اور اس کے علاوہ بھی دو تین دفعہ آ چکا تھا۔ مگر میرے دوستوں کے لئے یہ جگہ نئی تھی۔ اطلاع یہ تھی کہ وہاں شدید برفباری ہوئی ہے۔ یہ صورتِ حال میرے لئے بھی نئی تھی۔ پروگرام بن گیا۔ میرے اور نعیم کے علاوہ نور الامین خان، مسعود صدیقی اور ایک فلسطینی دوست رشید اس گروپ میں شامل تھے۔

ہم کیوٹو سے ایک ٹرین کے ذریعے ماؤنٹ ہی اے کے دامن تک پہنچے۔ ہر طرف برف

ہی برف نظر آ رہی تھی۔ وہاں سے ہم نے کیبل کار کا سفر شروع کیا۔ یہ ریل ہی ہوتی ہے مگر بہت طاقتور۔ یہ تقریباً ۳۰ کے زاویے پر پہاڑ پر چڑھتی ہے۔ سوائے پٹریوں کے ہر طرف برف تھی۔ اس کی سفیدی اور چمک بتا رہی تھی کہ یہ بالکل تازہ ہے۔

اس کیبل کار نے ہمیں پہلے سٹاپ پر لے جانا تھا جو کل اونچائی کے تقریباً نصف پر ہے۔ ہمیں اس سفر میں پندرہ منٹ لگے۔ یہ پہلی منزل بجائے خود ایک بہت پرسکون تفریحی مقام ہے۔ یہاں سے کیوٹو شہر اور اس کے پیچھے قطار در قطار پہاڑ اور ان پر لہراتے بادل ایک ناقابلِ فراموش نظارہ ہیں۔

اگرچہ ہر طرف برف تھی مگر دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور آسمان پر کہیں کہیں روئی کے گالوں جیسے سفید بے ضرر بادل نظر آ رہے تھے۔ کیوٹو شہر کی تعمیرات موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ پہاڑوں میں گھری اس وادی میں موتی بکھیر دیے گئے ہوں۔ دور اُفق پر برف پوش پہاڑ پورے منظر پر چھائے ہوئے تھے۔

وہاں بچوں کے لئے پارک بھی تھا اور ایک چھوٹی سی کینٹین بھی تھی مگر اکا دکا لوگ ہی رکتے تھے۔ زیادہ تر چوٹی کی طرف اپنا سفر جاری رکھتے تھے۔ اس لئے بھی یہ جگہ پرسکون تھی۔

ابھی دس ہی بجے تھے اور ہمارے پاس وقت کی کمی نہیں تھی۔ اس لئے وہاں آدھا گھنٹہ گزارا۔ ایک مقصد یہ بھی تھا کہ تازہ دم ہو جائیں۔ ہمارا ارادہ روپ کار (rope car) کی بجائے پیدل چوٹی پر جانے کا تھا۔ روپ کار کو ہمارے ہاں کیبل کار کہا جاتا ہے۔

•••

ہم چلے تو سامنے سڑک تھی جس پر چار پانچ انچ برف تھی۔ یہ سڑک ایک گھنے جنگل میں جا رہی تھی جس کے درختوں کے پتے بھی برف کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے۔ ہمارے جسم تو گرم کپڑوں سے ڈھکے ہوئے تھے، سر پر بھی ٹوپیاں تھیں، مگر بوٹ عام ہی تھے۔ یہاں فل بوٹ کی ضرورت تھی۔ اس لئے چلتے ہوئے برف جوتوں میں گھس رہی تھی۔ ہم تھوڑی تھوڑی دیر بعد رکتے، جوتوں سے برف نکالتے اور چل پڑتے۔

مگر یہ عمل ہمارے لئے پریشانی کا باعث نہیں تھا۔ ہم بڑے مزے میں تھے۔ نعیم فوٹو گرافی میں مصروف تھا تو میں وڈیو بنا رہا تھا۔ باقی دوست ایک دوسرے پر برف پھینک رہے تھے۔

آدھے گھنٹے بعد ہم اس مقام پر پہنچے جہاں سکینگ (skiing) کے متوالے جاتے ہیں۔ سردیوں میں اسی فیصد لوگ یہاں اسی کام کے لئے آتے ہیں۔ ایک بہت بڑی ڈھلوان تیار کی گئی ہے جو موسم سرما میں برف سے ڈھکی ہوتی ہے۔ اگر قدرتی برف نہ ہو تو مصنوعی برف پیدا کی جاتی ہے۔ نیچے سے اوپر جانے کے لئے چیئر لفٹ کا بندوبست ہے۔ اوپر جائیں اور سکینگ کرتے نیچے آجائیں۔ پھر اوپر جائیں اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

وہاں بہت زیادہ رش تھا۔ ہمارے پاس تو سکینگ کا سامان تھا نہیں اس لئے صرف تماشہ ہی دیکھ سکتے تھے اور یہ کام ہم نے جی بھر کر کیا۔ بڑے دلچسپ مناظر تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے بھی سکینگ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ برف نرم تھی اس لئے چوٹ کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ حتیٰ کہ ایک دو تین سالہ بچہ بھی سکینگ کر رہا تھا۔ دو چار قدم پیچھے اس کا والد تھا جس نے اس بچے کو رسی کے ذریعے تھاما ہوا تھا۔

میں وڈیو بنا رہا تھا۔ نعیم فوٹوگرافی میں مصروف تھا۔ مسعود صاحب ویسے ہی بات کم کرتے تھے۔ اس لئے گفتگو کی زیادہ ذمہ داری خان صاحب اور ہمارے فلسطینی دوست رشید نے سنبھالی ہوئی تھی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ مختلف لہجوں کی وجہ سے دونوں کو ایک دوسرے کی بات کم ہی سمجھ آ رہی تھی۔ جہاں ہمیں فرصت ملتی اور مدد کر سکتے تو کر دیتے۔ مگر یہ ہمیشہ ممکن نہ ہوتا۔ اس پہ طرہ یہ کہ رشید مسلسل بولتا تھا اور چاہتا تھا کہ اس کی باتوں کا جواب ملتا رہے۔

●●●

اس مقام سے ہمیں چوٹی نظر آ رہی تھی اور وہاں بنا ہی اے (Hlei) ہوٹل سامنے ہی تھا۔ اگر سیدھا راستہ ہوتا تو شاید ہم پندرہ بیس منٹ میں پہنچ جاتے، مگر یہ پہاڑی راستہ تھا اور برف میں سے گزرنا تھا۔ ہمیں تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔

اس پہاڑ کی چوٹی ایک کھلی جگہ ہے جہاں کئی تعمیرات ہیں اور سڑکیں بھی بنی ہوئی ہیں۔ یہاں پر این ریاکو جی (Enryakuji) مندر کی کئی عمارتوں کے علاوہ فرانسیسی طرز کی عمارات بھی ہیں جن میں ایک میوزیم بھی شامل ہے۔

یہ چوٹی تھی اس لئے سب سے زیادہ برف یہیں تھی۔ سڑک اور کناروں کی پہچان ختم ہو چکی تھی۔ بھوک بھی چمک رہی تھی اور جسم بھی سردی سے شل تھے، اس لئے ہم نے سیدھا ہوٹل کا رخ

کیا۔ ہم وہاں ایک گھنٹہ ٹھہرے۔ سوپ پیا، کھانا کھایا، جوتے صاف کئے اور سستا کر باہر نکلے۔

•••

اس مقام کی مذہبی اور تاریخی اہمیت اپنی جگہ مگر سیاحوں کی اصل دلچسپی قدرتی مناظر ہیں۔ یہاں سے دور تین ہزار فٹ نیچے بیوا (Biwa) جھیل اور شیگا (Shiga) شہر نظر آتے ہیں۔

بیوا جھیل جاپان کی سب سے بڑی جھیل ہے اور اس کا شمار دنیا کی قدیم ترین جھیلوں میں ہوتا ہے۔ اس کی عمر چالیس لاکھ سال ہے۔ اس کی شکل ایک قدیم جاپانی ساز سے ملتی ہے اور اسی وجہ سے اس کا نام بیوا ہے۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس کے رقبے سے ہو جاتا ہے جو ۶۷۰ مربع کلومیٹر ہے۔ یہ گردونواح کے ڈیڑھ کروڑ لوگوں کو پینے کا پانی فراہم کرتی ہے۔

اتنی بلندی سے کسی منظر کی الگ ہی خوبصورتی ہوتی ہے۔ اسے طائرانہ نظارہ بھی کہہ سکتے ہیں مگر شاید کچھ ہی پرندے اتنی بلندی پر اڑتے ہیں۔ ہم تین ہزار فٹ نیچے دیکھ رہے تھے اس کے باوجود جھیل کی وسعت ہماری نظروں میں نہیں سما رہی تھی۔ بائیں طرف اور سامنے تو لگتا تھا کہ کسی سمندر کو دیکھ رہے ہیں البتہ دائیں طرف شیگا شہر نظر آتا تھا اور وہاں بھی جھیل پر بنا ایک پل ہی نمایاں تھا۔ باقی پورا شہر ہے بھی یا نہیں کی طرح تھا۔

میں اپنے وڈیو کیمرے میں یہ تمام چیزیں سمونے کی کوشش کر رہا تھا مگر خان صاحب بار بار مجھ سے کیمرے کا تقاضا کر رہے تھے۔ وہ اسے دوربین کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ وہ کیمرہ میں نے کچھ ہی دن پہلے خریدا تھا اور اس دور کے لحاظ سے جدید ترین تھا۔ وہ کسی بھی چیز کو ۴۸ گنا بڑا کر کے دیکھ سکتا تھا۔ وہاں پر لگی دوربینوں کی طاقت اتنی نہیں تھی، اس لئے خان صاحب کو میرے کیمرے میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ مگر مجھے کورا جواب دینا پڑا۔ جب میں فلمبندی مکمل کر چکا تو کیمرہ ان کے حوالے کر دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی بچے کو اس کا پسندیدہ کھلونا مل گیا۔ وہ خوشی سے نعرے لگاتے دس پندرہ منٹ تک لطف اندوز ہوتے رہے۔

•••

منظر کی دلکشی ہمیں وہاں رکنے پر مجبور کر رہی تھی مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ دن ڈھلنا شروع ہو گیا تھا اور ہم نے ابھی ایک اور ایڈونچر کرنی تھی۔ یعنی جنگل میں سے راستہ بناتے ہوئے پیدل اترنا تھا۔

جنگل بالکل سنسان تھا اور راستہ بہت دشوار۔ برف کی دبیز تہہ میں ڈھکی تنگ سی پگڈنڈی پر ہر قدم احتیاط سے ڈالتے ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ ہمارے علاوہ جو انسانی آوازیں سنائی دے رہی تھیں وہ مہدی حسن اور نور جہاں کی تھیں۔ میں نے اپنے ٹیپ ریکارڈر میں پرانے گانے لگائے ہوئے تھے جو فضا میں مرتعش ہو رہے تھے۔ اس آواز کا جادوئی اثر تھا اور ایک عجب رومانوی سا ماحول بن گیا تھا۔ لگتا تھا کہ دیارِ غیر کی فضا میں اپنے وطن کی خوشبو بکھر رہی ہو۔

مسعود صدیقی صاحب کم بولتے ہیں، مگر اس دفعہ بولے تو سراسیمگی کی ایک لہر دوڑا دی۔ کہنے لگے:

'میں نے پڑھا ہے کہ پچھلے دنوں اس جنگل میں ایک قتل ہوا ہے۔'

جاپان میں قتل؟ عجیب بات تھی۔ مگر وہ اپنی خبر کی صداقت پر مصر تھے۔

جب شام ڈھل رہی ہو، ہر طرف گھنے درخت ہوں، اور اجنبی دیس ہو تو کچھ خوف کا طاری ہونا قدرتی بات تھی مگر نعیم صاحب ہر چیز سے بے نیاز ماحول کے سحر میں گرفتار تھے۔ فوٹوگرافی بھول چکے تھے اور گروپ سے علیحدہ ہو کر کبھی ایک طرف نکل جاتے کبھی دوسری طرف۔

خان صاحب بولے:

'رانجھا ہیر کو ڈھونڈ رہا ہے۔'

میں نے گرہ لگائی:

'دیکھو ڈھونڈتے ڈھونڈتے کتنا پتلا ہو گیا ہے۔'

رشید کو سمجھ تو کچھ نہیں آ رہا تھا مگر ہماری باتیں دلچسپی سے سن رہا تھا۔ مسعود صاحب چنگاری پھینک کر خاموش ہو گئے تھے۔

کوئی آتا جاتا ہو تو راستے کی خبر بھی رہے۔ مگر یہاں تو ہمارے سوا کوئی تھا ہی نہیں۔ نتیجہ یہ کہ راستہ بھول گئے۔ شام ہو چکی تھی۔ اگر اس سنسان جنگل میں رات ہو جاتی تو سرد موسم میں ہمارا کیا ہوتا؟

اسی پریشانی میں تھے کہ ہمیں دو ہٹے کٹے جاپانی اپنی طرف آتے نظر آئے۔ مسعود صاحب کی چنگاری کے زیرِ اثر وہ ہمیں مشکوک اور جرائم پیشہ لگے اور ہم کسی بھی صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے تیار ہو گئے۔ مگر جب وہ قریب آئے تو احساس ہوا کہ ان کے ارادے نیک ہی تھے اور وہ

خوش گپیاں کرتے جارہے تھے۔

خان صاحب اچھی جاپانی بول لیتے تھے،اس لئے انہیں آگے کیا۔ وہ لوگ بہت خوش اخلاقی سے ملے اور ہمیں صحیح راستے کا پتہ بتا دیا۔ ہم نے تہہ دل سے ان کا شکریہ ادا کیا اور تقریباً ایک گھنٹے کے مزید سفر کے بعد پہاڑ کے دامن تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ کل ہمیں دو گھنٹے لگے۔

مغرب کا وقت ہو چکا تھا مگر اب فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ ہم رات دس بجے تک اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔

●●●

۴

اوساکا قلعہ (Osaka castle) اوساکا کی سب سے مشہور عمارت ہے۔ اس کا شمار جاپان کی اہم ترین تاریخی عمارات میں ہوتا ہے۔ سولہویں صدی عیسوی میں اس نے جاپان کو متحد کرنے میں ایک بڑا کردار ادا کیا۔

یہ جاپان کا سب سے بڑا قلعہ ہے۔ اس کی تعمیر کا آغاز ۱۵۸۳ عیسوی میں جاپانی تاریخ کے اہم ترین شوگن میں سے ایک تویوتامی ہی دے اوشی (Toyotami Hideyoshi) نے کیا۔ ۱۵۹۷ عیسوی میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی۔ کچھ ہی عرصہ بعد شوگن مر گیا اور اس کے بیٹے تویوتامی ہی دے یوری (Toyotami Hideyori) نے انتظام سنبھالا۔

اس کی مرکزی عمارت ایک مربع میل زمین کے ٹکڑے پر بنی جس کی باہر سے دیکھنے پر پانچ منزلیں ہیں مگر اندرونی طور پر آٹھ منزلیں ہیں۔ اس کی بنیاد میں پتھر بھرے گئے اور اس کے چاروں طرف پتھر کی دیواریں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک گہری اور چوڑی خندق اسے چاروں طرف سے گھیرتی ہے۔

۱۶۰۰ عیسوی میں توکوگاوا ای اے یاسو (Tokugawa Ieyasu) نیا شوگن بنا اور ۱۶۱۴ عیسوی میں اس نے دو لاکھ فوج کے ساتھ اوساکا قلعہ پر چڑھائی کر دی مگر اسے زیر کرنے میں ناکام رہا۔ واپس جاتے ہوئے اس نے خندق کو پر کر دیا۔ مگر اگلے ہی سال قلعہ کے حکمران نے اس خندق کو دوبارہ بنانا شروع کر دیا۔ نئے شوگن کو جب یہ اطلاع ملی تو وہ غصہ سے پاگل ہو گیا اور زیادہ

تیاری کے ساتھ حملہ آور ہو کر قلعہ پر قبضہ کرلیا اور وہاں موجود فوجوں کا صفایا کر دیا۔ اس جنگ کے دوران قلعہ کو شدید نقصان پہنچا۔

کچھ عرصہ بعد شوگن مر گیا تو اس کے بیٹے نے قلعہ کی تعمیر نو کا آغاز کیا۔ اس وقت کی بنی دیواریں آج بھی موجود ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ پتھروں کو جوڑنے کے لئے کوئی مسالہ استعمال نہیں ہوا بلکہ ان کے دندانے بنا کر ایک دوسرے میں پھنسا دیا گیا ہے۔

قلعہ باہر سے اپنی قدیم شکل میں ہی ہے مگر اندر دورِ جدید کی تمام چیزیں موجود ہیں جن میں ایک میوزیم بھی ہے۔ یہ قلعہ سفید رنگ کا ہے اور اس کی مخروطی چھت کے دونوں طرف مچھلیوں کے پچھلے دھڑ بنے ہوئے ہیں۔

•••

ایک دن جب موسم صاف تھا، میں نے اور نعیم نے اوسا کا قلعہ جانے کا پروگرام بنایا۔ ہمارے ساتھ کچھ اور لوگ بھی شامل ہو گئے جن میں نور الامین کے علاوہ کچھ عرب دوست بھی تھے۔

بہترین موسم ہونے کی وجہ سے قلعے میں رش بہت زیادہ تھا۔ ابھی ہم قلعہ کے احاطہ میں داخل ہی ہوئے تھے کہ اس کی حفاظتی دیوار نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ بہت بڑے بڑے پتھروں سے بنی ہوئی تھی۔ ان پتھروں میں سب سے بڑا ۳۵ فٹ چوڑا اور ۱۵ فٹ اونچا تھا۔ بعد میں تحقیق کی تو پتہ چلا کہ اس کا رقبہ ۴۸ مربع میٹر اور وزن ۱۰۵ ٹن ہے۔ یہ قلعہ میں استعمال ہونے والا سب سے بڑا پتھر نہیں۔ اس سے بھی بڑے تین پتھر قلعہ کی تعمیر میں استعمال ہوئے ہیں مگر نظروں سے اوجھل ہیں۔

سوال یہ تھا کہ اتنے بڑے پتھر وہاں پہنچے کیسے؟ یہی سوال اہرام مصر کے پتھروں کے بارے میں کیا جاتا ہے۔ مجھے بعد میں وہ پتھر دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا مگر اوسا کا قلعہ کے پتھر ان کی نسبت کافی بڑے تھے۔

جب ہم قلعہ کے اندر داخل ہوئے تو جواب مل گیا۔ یہ پتھر گرینائٹ تھے اور پورے جاپان سے انہیں اکٹھا کیا گیا تھا۔ میوزیم کی دیواروں پر ان قدیم اوزاروں اور ہتھ گاڑیوں کی اس زمانے کی بنی ہوئی تصویریں آویزاں تھیں جو پوری طرح وضاحت کرتی تھیں کہ وہ پتھر وہاں کیسے پہنچے۔ اس قلعہ کی تعمیر میں ۵ لاکھ پتھر استعمال ہوئے۔

میوزیم میں اس قلعہ کو بنانے والے شوگن کی بہت بڑی تصویر بھی آویزاں تھی۔ وہ تخت پر بیٹھا تھا۔ چوڑے کندھے اور مضبوط جسم مگر چہرہ لمبوترا اور پچکے ہوئے گال تھے۔ چونکہ یہ تصویر بھی اس کی زندگی کے دوران بنی تھی اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ اصل کے قریب تر تھی۔

اس کے علاوہ مختلف ادوار کی تلواریں، زرہ بکتر وغیرہ بھی میوزیم میں تھے۔ زیادہ تر تلواریں سیدھی تھیں، اسلامی تلواروں کی طرح ہلال کی شکل میں نہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ان سیدھی تلواروں سے کاٹنے کا کام کم اور گھونپنے کا کام زیادہ لیا جاتا تھا۔ بوقت ضرورت خودکشی کے کام بھی آتی تھیں جو اس زمانے میں عام اور قابل عزت تھی۔

جب ہم قلعہ کی آخری منزل پر پہنچے تو پورے شہر کا زبردست نظارہ تھا۔ شمال میں اوساکا کے twin towers تھے تو مشرق میں نارا کے پہاڑ نظر آرہے تھے۔

مگر اصل قابل توجہ چیز قلعہ کے دامن میں ہی تھی۔ قلعے کے وسیع میدانوں میں سفید اور ہلکے گلابی رنگوں کی بہار تھی اور لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔

یہ رنگ چیری کے پھولوں کے تھے جو موسم بہار میں کھلتے ہیں۔ جاپانی میں انہیں ساکورا (sakura) کہتے ہیں۔

جاپانیوں کے نزدیک ساکورا کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ہر سال پیشینگوئی کی جاتی ہے کہ کن دنوں میں ان پھولوں نے کھلنا ہے۔ لوگ چھٹیاں لے لیتے ہیں اور ایسے باغات کا رُخ کرتے ہیں جہاں ان درختوں کو اسی مقصد کے لئے اگایا گیا ہے۔ وہ وہاں تمام دن ان درختوں کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور پکنک مناتے ہیں۔ اس کو ہانامی (Hanami) کہا جاتا ہے اور یہ تہوار صدیوں پرانا ہے۔

دوسری جنگِ عظیم میں ان پھولوں کو قومیت کا جذبہ ابھارنے کے لئے بھی استعمال کیا گیا۔ جاپان کے خودکش پائلٹ جنہیں کامی کازے (kamikaze) کہا جاتا تھا، اپنے جہازوں پر ان پھولوں کو پینٹ کرواتے اور اپنے ساتھ ان کی ٹہنیاں بھی لے جاتے۔ انہی کامی کازے پائلٹوں نے پرل ہاربر پر کھڑے بحری جہازوں کی چمنیوں میں گھس کر انہیں تباہ کر دیا تھا اور امریکہ کے جنگ میں داخل ہونے کا سبب بنے تھے۔

تاریخ میں اس سے ذرا پیچھے جائیں تو جاپانی جو بھی نیا علاقہ فتح کرتے تھے تو اولین کاموں میں سے ایک ان درختوں کو اگانا تھا۔ یہ اس بات کا اعلان ہوتا کہ یہ اب جاپانی علاقہ ہے۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ساکورا جاپان کا قومی پھول ہے مگر دلچسپ بات ہے کہ سرکاری طور پر کبھی یہ اعلان نہیں کیا گیا۔

●●●

۵

کیوٹو میں بے شمار قابلِ دید مقامات ہیں۔ کچھ کا ذکر ہو چکا، کچھ کا ذکر باقی ہے۔

ایک دن میں نے اور نعیم نے کیومی زو دیرہ (Kiyomizu dera) جانے کا پروگرام بنایا۔ یہ مندر دنیا کے نئے سات عجائبات میں شامل ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اس کی وجہ اس کی مذہبی اہمیت اور گردونواح کی خوب صورتی ہے۔ یہ پہاڑی علاقہ ہے اور شہر کے مشرق میں ایک پرسکون قصبہ کا حصہ ہے۔

اس کی ابتدائی تعمیر ۷۸۸ عیسوی میں ہوئی مگر موجودہ عمارات ۱۶۳۳ عیسوی میں بنیں۔

یہاں ایک آبشار بھی ہے اور اسی نسبت سے اس مندر کا نام ہے جس کا مطلب ہے 'صاف پانی'۔

ہمارے لئے تو اس کی کشش اس کی خوب صورتی میں تھی۔ اشرف صاحب بھی اس پروگرام میں شامل ہو گئے۔

●●●

جب ہم اس قصبے میں پہنچے تو مندر تک جاتی گلیوں کے دونوں طرف صاف ستھری دیہاتی دوکانیں تھیں جن میں عقیدت مندوں کی دلچسپی کی چیزیں اور مندر کے سوونیر بکتے تھے۔ ہم جلدی پہنچ گئے تھے اس لئے اکا دکا شخص ہی نظر آ رہا تھا۔ مندر تک پہنچنے کے لئے کچھ سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھیں۔ ہم پہلے پلیٹ فارم پر پہنچ کر کچھ دیر کے لئے منظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے رک گئے۔

ابھی دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ لکڑی کے سینڈلوں کی چاپ سنائی دی۔ دیکھا تو دو گیشائیں سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔ ان سے اپنا لباس سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ جب وہ اوپر پہنچیں تو ایک دو لوگوں نے جو ان کے منتظر تھے، لباس کو ٹھیک کیا اور وہ لوگ آگے روانہ ہو گئے۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ ان لڑکیوں کے لئے نیا تجربہ تھا۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ کوئی تھیٹر تو تھا نہیں جہاں وہ یہ کوسٹیوم پہن کر اداکاری کے لئے آئیں۔ عین ممکن ہے کہ وہ نئی نئی اس پیشے میں داخل ہوئی ہوں اور کوئی مذہبی رسم ادا کرنے کے لئے آئی ہوں۔

کچھ دیر بعد ہم نے بھی وہی راستہ اختیار کیا تو سامنے ہی آبشار نظر آئی جو تیس چالیس فٹ ہی اونچی تھی۔ یہاں کافی لوگ جمع تھے جن میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ سب لوگ اس آبشار کا پانی پینے کے متمنی تھے۔ انہیں یقین تھا کہ یہ پانی پینے سے ان کی مرادیں پوری ہو جائیں گی اس لئے انہوں نے جاپان کے تمام علاقوں سے یہاں تک کا سفر کیا تھا۔

یہ تو مرادیں پانے کا آسان طریقہ تھا۔ مگر قریب ہی ایک جگہ تھی جہاں جان پر کھیلنا پڑتا تھا۔

اس آبشار سے کچھ ہی فاصلے پر مندر کی مرکزی عمارت ہے۔ اس کے صحن کا پھیلاؤ پہاڑ کی حدود سے باہر تک ہے۔ ہوا میں معلق اس صحن سے نیچے پہاڑ تک کا فاصلہ ۴۳ فٹ ہے۔ قدیم عقیدہ کے مطابق جو اس صحن سے پہاڑ پر چھلانگ لگاتا اور بچ جاتا، اس کی تمام مرادیں پوری ہو جاتیں۔ ایڈو (Edo) دور (۱۶۰۰ سے ۱۸۶۸ عیسوی) کے دوران ۲۳۴ لوگوں نے اس طرح مرادیں پانے کی کوشش کی اور حیران کن طور پر ۸۵ فیصد زندہ بچ رہے۔ ۱۸۶۸ عیسوی میں اس پر پابندی لگا دی گئی۔

مگر اب بھی صحن میں لوگوں کی بھیڑ تھی۔ یہ لوگ چھلانگ لگانے والے نہیں تھے۔ وہ آس پاس کے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہم بھی ان میں شامل ہو گئے۔ دور دور تک سرسبز پہاڑی سلسلے اور ان کے دامن میں پھیلے جنگلات نظر آ رہے تھے۔ موسم بالکل صاف تھا اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں ایک آدھ گھنٹہ گزارا جا سکتا تھا۔

وہاں سے نکلے تو قریب ہی جیشو (Jishu) مندر تھا جہاں اوکونیشی (Okunishi) نامی

محبت کے دیوتا کا بت ہے۔ وہاں ساٹھ فٹ کے فاصلے پر دو پتھر نصب ہیں۔ عقیدت مند ایک پتھر کے قریب کھڑے ہو کر آنکھوں پر پٹی باندھتے ہیں اور دوسرے پتھر کی طرف قدم اٹھاتے ہیں۔ اگر وہ بغیر کسی مدد کے وہاں تک پہنچ جائیں تو مطلب ہے کہ انہیں اپنی محبت بغیر کسی وسیلے کے مل جائے گی۔ اگر وہ راستے سے بھٹک جائیں اور کوئی ساتھی انہیں صحیح راستے پر ڈالے تو اس کا مطلب ہے کہ اپنی محبت پانے کے لئے حقیقی زندگی میں بھی کسی ساتھی کی مدد درکار ہوگی۔ یہاں ویسی بے ایمانی نہیں ہو سکتی تھی جیسی میں نے کادانیشی میں کی تھی۔ یہ سنجیدہ معاملہ تھا اور دیوتا کے غضب کو آواز دینے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہاں نوجوانوں کا ایک مجمع تھا جن میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ سب بے صبری سے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

•••

ہمارے اس دن کے پروگرام میں ایک اور مندر بھی شامل تھا جسے سان گوسان گیندو (Sangosangendo) کہتے ہیں۔ اسے ۱۱۶۴ عیسوی میں تعمیر کیا گیا۔ یہاں ہر سال جنوری میں ایک تہوار ہوتا ہے جہاں پورے جاپان سے وہ لوگ آتے ہیں جنہیں سر درد کی شکایت رہتی ہو۔ ایک مقدس درخت کی شاخ سے ان کے سر کو چھوا جاتا ہے۔

مگر ہماری دلچسپی وہاں پر موجود مہاتما بدھ کے ایک بت کو دیکھنے میں تھی جس کے ایک ہزار بازو ہیں۔ اسے جاپان کے قومی خزانے کا حصہ قرار دیا گیا ہے۔ بڑے بت کے علاوہ اس کے دونوں طرف کھڑے انسانی قد و قامت کے ایک ہزار بت اور ہیں۔ انہیں جاپانی سائپرس (cyprus) کی لکڑی سے بنا کر سونے کے پرت چڑھائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ تیس کے قریب پہریدار بت ہیں۔

اس ہال کے اندر جہاں یہ بت کھڑے ہیں، نیم اندھیرا تھا۔ اس طرح ان کی سنہری چمک زیادہ نمایاں ہو رہی تھی۔ وہاں اگر بتیاں بھی جل رہی تھیں اور تقدس سے بھرا ماحول تھا۔ زائرین بڑی عقیدت سے ان بتوں کے چاروں طرف بنی راہداریوں پر نپے تلے قدموں سے چل رہے تھے۔ ہمارے دل تو اس وقت عقیدت سے بالکل خالی تھے مگر دوسرے لوگوں کا احترام کرتے ہوئے ہم بھی اس مرحلے سے اسی طرح گزرے۔

اگر چہ ان ہزار بتوں کا تعلق بدھ مت سے ہے مگر محافظ بتوں کا تصور ہندو مت کے قدیم کتابچوں سے لیا گیا ہے اور وہ شنتو مذہب کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اس مندر کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ یہاں پر بدھ مت اور شنتو مذہب ایک ہی جگہ نظر آتے ہیں۔

●●●

۶

قدرتی موتی نایاب پتھروں اور دھاتوں کی طرح ہمیشہ بہت قیمتی رہے ہیں۔ان کا ملنا شاید قیمتی پتھروں اور دھاتوں سے بھی مشکل ہے۔ یہ صدیوں سے چھپے ہوئے خزانے نہیں ہوتے بلکہ ایک قدرتی عمل سے بنتے ہیں جس کی مدت بیس سال تک ہو سکتی ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ سیپ یا صدف (جو کہ ایک آبی مخلوق ہے) کے جسم میں کسی طفیلی کیڑے یا چوٹ کی وجہ سے کوئی زخم بن جاتا ہے تو وہ اسے مندمل کرنے کے لئے ایک رطوبت خارج کرتا ہے جو آہستہ آہستہ پتھر کی طرح سخت ہو جاتی ہے۔اسے نیکر (nacre) کہتے ہیں۔کیونکہ اصل سبب اپنی جگہ پر ہی ہوتا ہے اس لئے سیپ کا جسم مسلسل تکلیف میں ہوتا ہے اور اس کے اوپر نیکر کا ایک اور خول چڑھا دیتا ہے۔اس طرح کئی تہیں بن جاتی ہیں۔ ہر تہہ ہموار اور چمکدار ہوتی ہے۔عموماً اس کی رنگت ہلکی گلابی ہوتی ہے۔

یہ موتی صدیوں سے انسانوں کو لبھاتے آئے ہیں۔اب حضرت انسان نے ان کی مصنوعی کاشت کے طریقے ڈھونڈ لئے ہیں۔ یہ مصنوعی موتی بھی قیمتی ہوتے ہیں مگر اصل موتیوں سے بہت کم۔

اوساکا سے دو سو کلو میٹر مشرق میں توبا نامی ایک ساحلی قصبہ ہے جہاں موتیوں کی مصنوعی کاشت کی جاتی ہے۔ظفر اقبال بھٹی صاحب نے وہاں کی سیر کا مشورہ دیا۔ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ایک دن پروگرام بنالیا۔

میرے علاوہ اس گروپ میں نعیم، ظفر اقبال اور مسعود صدیقی شامل تھے۔ دو سو کلومیٹر کا لمبا سفر تھا جس میں کئی ٹرینیں بدلنی تھیں، اس لئے ہم فجر کے وقت ہی چل پڑے۔ ظفر اقبال صاحب ہی ہمارے گائیڈ تھے۔ چھوٹے بڑے دیہات اور قصبات سے گزرتے ہوئے ہم گیارہ بجے منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ ہم جن حیرت انگیز مشاہدات سے گزرنے والے تھے ان کا ظفر اقبال صاحب کو بھی اندازہ نہیں تھا۔

●●●

توبا بحرالکاہل کی ای سے (Ise) خلیج کے سامنے واقع ہے۔ دنیا میں سب سے پہلے ۱۸۹۳ عیسوی میں سیپ کی مصنوعی افزائش یہیں پر ایک مقامی شخص مکی موتو کوئی چی (Mikimoto Koichi) نے شروع کی۔ اسی نسبت سے یہاں موتیوں کا مشہور عالم میوزیم ہے جسے مکی موتو پرل میوزیم (Mikimoto Pearl Museum) کہا جاتا ہے۔

جب ہم توبا پہنچے تو مکی موتو صاحب نے ہی ہمارا استقبال کیا۔

ہماری پہلی نظر جس چیز پر پڑی وہ ان صاحب کا بیس فٹ اونچا مجسمہ تھا۔ چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی بلکہ غصہ تھا۔ نجانے چہرے پر مسکراہٹ کیوں نہیں سجائی گئی۔ لگتا تھا کہ باباجی زندگی بھر کبھی مسکرائے تھے ہی نہیں۔

ہم نے باباجی کے ساتھ کچھ تصاویر کھینچیں اور سمندر کی طرف چل پڑے۔ وہاں ہمیں سفید واٹر پروف لباس میں ملبوس غوطہ خور خواتین نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ساحل سے وہ ایک موٹر بوٹ پر بیٹھیں اور سو دو سو گز دور سمندر میں جا کر ایک ایک کر کے غوطہ زن ہو گئیں۔ ہر غوطہ خور خاتون ایک بڑی لکڑی کی بنی ہوئی ٹوکری بھی ساتھ لے گئی جو پانی کی سطح پر تیرتی رہی۔ دو چار منٹ تک ہم دیکھتے رہے مگر ان میں سے کوئی بھی سانس لینے کے لئے سطح سمندر پر نہیں آئی۔

ان خواتین کو آما (Ama) کہا جاتا ہے جس کا مطلب ہے سمندری عورتیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ ان کی تاریخ دو ہزار سال سے بھی پرانی ہے۔ اس جدید دور میں بھی یہ آکسیجن کا سہارا نہیں لیتیں۔ سفید لباس صرف ان آما کے لئے مخصوص ہے جنہوں نے سیاحوں کو لبھانا ہو۔

ان کا بنیادی کام سمندر میں سیپ تلاش کرنا ہی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ نوجوان لڑکیوں کی نسبت ذرا زیادہ عمر کی خواتین زیادہ دیر تک زیرآب رہ سکتی ہیں۔ اس کام کے لئے

عورتوں کی مردوں پر برتری مسلم ہے۔

•••

آسمان پر بادل بھی گرج رہے تھے اور بارش بھی شروع ہو گئی تھی۔ ہمیں سمندر کے نظارے کو خیر باد کہنا پڑا اور میوزیم میں داخل ہو گئے۔

واقعتاً ہم ایک عجائب گھر میں داخل ہو گئے اور ہماری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہاں بے شمار نوادرات تھے۔ سب کا ذکر تو ممکن نہیں۔ چیدہ چیدہ مندرجہ ذیل ہیں:

- موتیوں سے بنا گلوب جس میں ساڑھے بارہ ہزار موتی جڑے ہیں۔ اس کے علاوہ ۳۷۷ یاقوت اور ۳۷۷ ہیرے بھی اس کی خوبصورتی کو دوچند کرتے ہیں۔
- آزادی کی گھنٹی جس پر سوا بارہ ہزار موتی اور ۳۶۶ ہیرے جڑے ہیں۔
- پانچ منزلہ پگوڈا جس پر تیرہ ہزار موتی لگائے گئے ہیں۔
- ہی مے جی (Himeji) قلعہ کا ماڈل جس پر اسی ہزار موتی اور ۴۷۷ ہیرے، یاقوت، نیلم اور زمرد جڑے ہیں۔

ان نوادرات کی سجاوٹ کے لئے روشنیوں کا استعمال اس طرح کیا گیا ہے کہ ان کی چمک دمک پوری طرح اجاگر ہو جائے۔

اس کے علاوہ بے شمار انفرادی موتی بھی ہیں وہاں لیڈی ڈیانا کے کان کے چھلے میں استعمال ہونے والے ایک قدرتی موتی کی نقل بھی پڑی تھی۔ اصل موتی کی قیمت لکھی ہوئی تھی جو کروڑوں میں تھی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس موتی کی شکل گول نہیں تھی بلکہ بے ڈھنگی تھی۔

•••

اصلی موتیوں کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ عموماً بے ڈھنگے ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں مصنوعی افزائش سے پیدا شدہ موتی صحیح گولائی یا لمبائی میں ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی دلکشی زیادہ ہوتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قدرتی موتی جس ذرے وغیرہ یعنی نیوکلس (nucleus) کے گرد بنتا ہے اس کی شکل بے ہنگم ہوتی ہے اور اسی کے مطابق موتی کی شکل بن جاتی ہے۔ مصنوعی افزائش میں اس نیوکلس کو ایک باقاعدہ شکل دی جاتی ہے اور اسے سیپ کے جسم میں رکھ دیا جاتا ہے۔ اسی

کے مطابق کوئی شکل بنتی ہے۔

مگر بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ قدرتی موتی بھی تقریباً صحیح شکل میں ہوتے ہیں۔ اس مشکل کا حل ایکسرے ہے۔ اصلی موتی میں نیکر (nacre) کی کئی تہیں ہوتی ہیں جب کہ مصنوعی موتی میں صرف ایک بیرونی تہہ ہوتی ہے۔ یہ فرق ایکسرے سے صاف پتہ چل جاتا ہے۔

قدرتی موتی کے بننے میں چند سال سے لے کر بیس سال تک لگ سکتے ہیں جب کہ مصنوعی موتی کے بننے میں تین چار ماہ سے لے کر سات سال تک لگتے ہیں۔

●●●

قدرتی اور مصنوعی موتیوں کی قیمت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اداکارہ الیزبتھ ٹیلر کے لئے قدرتی موتیوں کا ایک ہار تیار کیا گیا جس کی قیمت گیارہ ارب روپے سے زیادہ تھی۔

آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ سب سے بڑے قدرتی موتی کا وزن ۳۴ کلو ہے جو حال ہی میں فلپائن کے قریب سمندر سے ملا ہے۔ اس کی قیمت کا اندازہ دس ارب روپے ہے۔

ہمارے لئے یہ قیمتیں بے معنی تھیں۔ دس ہزار ہوتیں یا دس کھرب۔ بہرطور یہ ہماری پہنچ سے بہت باہر تھیں۔ یہ خیال ضرور آیا کہ جس دنیا میں کروڑوں لوگوں کو دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہیں کیا اتنی رقمیں پتھروں اور موتیوں پر خرچنے والے ان کے لئے آسانیاں پیدا نہیں کر سکتے تھے۔

اگرچہ یہ سوال بہت اہم ہے مگر گھسا پٹا ہے۔ نہ جانے ہر شخص کی زندگی میں کتنی دفعہ یہ سوال سر اٹھاتا ہے مگر نتیجہ کچھ نہیں۔ زمانہ قبل از تاریخ سے یہ سوال اٹھ رہا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ معاشرتی انصاف انسانی جبلت میں ہے ہی نہیں۔ پیغمبروں اور مبلغوں کے زیرِ اثر کچھ ایسے معاشرے ضرور تشکیل پائے جہاں معاشرتی انصاف تھا مگر ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

قدرتی اور مصنوعی موتیوں کی قیمتوں کے موازنے سے اس بات کی نشاندہی بھی ہوتی ہے کہ خوبصورتی کی حیثیت ثانوی ہے۔ احساسِ برتری کو ثابت کرنے کی اہمیت اولین ہے۔ مصنوعی موتی یقیناً زیادہ دلفریب ہوتے ہیں مگر چونکہ وہ نسبتاً زیادہ آسانی سے دستیاب ہیں اس لئے سستے ہیں۔ قدرتی موتی نایاب ہیں اور اسے لئے بہت قیمتی ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ جتنی بھی قیمت مانگی جائے، دینے والے مل جاتے ہیں جو اپنے احساسِ برتری کی تسکین چاہتے ہیں۔

●●●

۷

ہوسٹل بدل گیا۔ اتنا عرصہ گزر گیا۔ مگر میرے معمولات میں تبدیلی نہیں آئی۔ سب سے اہم چیز خوراک تھی۔ اپنے کمرے میں بھی کھانا پکا لیتا تھا۔ اب جاپانی کھانوں سے بھی کافی واقفیت ہو گئی تھی اس لئے کبھی وہ بھی خرید لاتا۔ یہ ایک پیک کی ہوئی پلیٹ ہوتی جس کے مختلف حصے ہوتے۔ چاول، مچھلی، کچھ اچار اور ایک آدھ ٹکڑا کسی میٹھی چیز کا ہوتا۔

JICA کا پرانا ہوسٹل میں نے دیکھا ہوا تھا۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ یہ میرے ہوسٹل سے کافی دور تھا۔ وہاں کبھی کبھار میں دوستوں سے ملنے چلا جاتا تھا۔

پتہ چلا کہ JICA والے نیا ہوسٹل بنا رہے ہیں جو بہت شاندار، وسیع اور فائیو سٹار ہوٹل کے معیار کا ہے۔ اس کی ضرورت اس لئے پڑی تھی کہ جاپانی حکومت نے Pacific rim یعنی بحرالکاہل سے متصل ممالک کو ڈھیروں کے حساب سے سکولر شپ دینے شروع کر دیے تھے۔ اس کے علاوہ جو ملک ترقی کی منزلیں تیزی سے طے کر رہے تھے انہوں نے بھی اپنے اخراجات پر طالبِ علموں کو ترقی یافتہ ممالک بھیجنا شروع کر دیا تھا جن میں جاپان سرفہرست تھا۔

ان ممالک میں سب سے نمایاں ملائشیا تھا جہاں مہاتیر محمد کے دور کا عروج تھا۔ تعلیم پر کھلے دل سے خرچہ ہو رہا تھا اور ہزاروں کے حساب سے طالب علموں کو ترقی یافتہ ممالک بھیجا جا رہا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ میری یونیورسٹی میں ملائیشین طالب علموں کے غول نظر آنے شروع ہو

گئے تھے۔

•••

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ بات میں نے کھانے سے شروع کی اور ملائیشین طلبا تک پہنچ گیا؟ ان دو متفرق موضوعات کا آپس میں کیا تعلق بنتا ہے؟

تعلق یہ تھا کہ ملائیشین باعمل مسلمان ہوتے ہیں اور جب وہ اتنی بڑی تعداد میں JICA کے ہوسٹل میں ٹھہرے تو ان کے لئے حلال خوراک کا بندوبست کرنا پڑا۔

جب ہم ہوسٹل کی کینٹین میں جاتے تھے تو شوکیس میں لگے کھانوں میں جو حلال ہوتے تھے ان کی نشان دہی کی ہوتی تھی۔

اتفاق سے یہ نیا ہوسٹل میرے ہوسٹل سے آدھا کلومیٹر ہی دور تھا۔ ایک بڑی مشکل آسان ہوگئی۔ حلال گوشت لینے کوبے مسجد جانے کی ضرورت نہیں رہی۔ میں اکثر وہاں چلا جاتا اور اطمینان سے حلال کھانا کھالیتا۔

ایک دن میں وہاں گیا تو شوکیس میں ایک بڑی طشتری میں مرغی کی پوری ٹانگ تھی۔ ساتھ ہی ایک سینڈوچ پڑا تھا۔ مرغی کے سامنے حلال کی تختی کھڑی تھی۔ طشتری میں پڑی ان دونوں چیزوں کی مشترکہ قیمت تھی یعنی جس نے مرغی خریدنی تھی اسے سینڈوچ بھی لازمی لینا تھا۔

عام فہم بات یہ تھی کہ طشتری میں پڑی تمام چیزیں حلال تھیں۔

میں آرڈر دینے ہی لگا تھا کہ اچانک میری نظر سینڈوچ پر پڑی۔ بیچ میں سے گلابی گوشت جھانک رہا تھا۔

میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے میزبان سے پوچھا:

’یہ کیا ہے؟‘

اس نے بڑی بے اعتنائی سے جواب دیا:

’یہ پورک (سؤر کا گوشت) ہے۔‘

مجھے تو جیسے کرنٹ لگ گیا۔ میں نے جھنجھلا کر کہا:

’طشتری پر تو حلال لکھا ہوا ہے۔‘

جواب آیا:

'مرغی حلال ہے۔'

دراصل عام جاپانی کے ذہن میں حلال حرام کا تصور بٹھانا بہت مشکل ہے۔ باورچیوں کو حکم ہوا کہ فلاں جگہ سے حلال مرغی لے آؤ اور پکاؤ۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ پیچھے کیا فلسفہ ہے اس سے انہیں کیا غرض۔

اسی طرح ایک دن میں اور ڈاکٹر تبسم ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ ہم نے کھانے کا آرڈر دیا اور خاص طور پر کہا کہ پورک سے پرہیز ہے۔ مگر جب کھانا آیا تو گلابی رنگ جھانک رہا تھا۔ ویٹرس سے استفسار کیا تو کہنے لگی:

"It is ham not pork."

اب اس سے کون الجھتا کہ اسے یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ ham بھی سؤر کا گوشت ہوتا ہے۔

●●●

جیسا میں نے کہا JICA کے ہوسٹل کا معیار فائیو سٹار ہوٹل والا تھا۔ جو لوگ وہاں جاپانی وظیفے پر ٹھہرتے تھے، ان کے وظیفے تین چار لاکھ ین سے کم نہیں تھے۔ مگر آدھا وظیفہ ان کے ہوسٹل کے اخراجات کی مد میں کٹ جاتا تھا اور ان کے ہاتھ میں ڈیڑھ دو لاکھ ین ہی آتے تھے۔

اس ہوسٹل میں صرف نوجوان طالبِ علم ہی نہیں ہوتے تھے، کچھ ماہ سے لے کر ایک سال تک کی مدت کے وظائف پر بڑے افسر بھی آتے تھے۔ یہاں کئی سعودیوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ دیگر امیر عرب ممالک کے لوگ بھی مل جاتے تھے۔

کئی پاکستانیوں سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ سب بیوروکریٹ تھے جو ایسے سکولرشپ پر آتے تھے جن پر ان کا کوئی حق نہیں ہوتا تھا۔ متعلقہ مضمون سے ان کا دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا تھا۔

ہوتا یہ تھا۔۔۔ بلکہ اب بھی ہوتا ہوگا کہ بیرونی سکولرشپ متعلقہ وزارتوں کے پاس جاتے تھے۔ وہ بجائے اس کے کہ انہیں حقدار امیدواروں تک پہنچاتے، دبا لیتے تھے اور اسلام آباد میں بیٹھے بیوروکریٹ بھائی بندوں میں ازراہ دوستی بانٹ دیتے تھے۔

سمجھ نہیں آتا کہ کیا تبصرہ کروں۔ اس سے بڑی ڈاکہ زنی کیا ہو سکتی ہے۔

●●●

۸

ایک دن نعیم نے کہا کہ اس نے سیر کے لئے ایک نئی جگہ ڈھونڈی ہے جس کا نام کویا (Koya) ہے۔ پہاڑوں میں گھری اونچی وادی ہے۔ بدھوں کی بہت مقدس جگہ ہے۔ بہت اونچے اونچے درخت ہیں۔

نعیم یہ سب کچھ نہ بھی بتاتا تو بھی میں تیار ہو جاتا۔ پروگرام بنا، مسعود صدیقی صاحب بھی شامل ہو گئے اور ایک چمکیلی مگر سرد صبح ہم نے کویا کا رخ کیا جسے جاپانی احترام سے کویا سان (Koyasan) بھی کہتے ہیں۔

ایک گھنٹہ کے سفر کے بعد ہم نامبا (Namba) پہنچے اور وہاں سے ٹرین بدل کر گوکوراکوباشی (Gokurakubashi) سٹیشن تک گئے۔ وہاں سے ایک کیبل کار نے ہمیں پانچ منٹ میں کویا تک پہنچا دیا۔

یہ بدھ مت کے کویا سان شن گون فرقے کی مقدس ترین جگہ ہے اور یہاں پہلا مندر ۸۱۹ عیسوی میں بنا۔ کویا کی سمندر سے بلندی ڈھائی ہزار فٹ ہے اور اس کے چاروں طرف آٹھ پہاڑ ہیں۔ عقیدت مند اسے کنول کے پھول سے تشبیہ دیتے ہیں۔

اس قصبہ میں مذہبی تعلیم کی ایک یونیورسٹی اور ۱۲۰ مندر ہیں۔ مگر اس کی اصل وجہ شہرت جاپان کا سب سے بڑا قبرستان ہے جہاں جنگوں میں مارے گئے فوجیوں اور دیگر نامور شخصیات کی قبریں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جاپان کی دو تہائی تاریخی شخصیات یہاں دفن ہیں۔

ہم کیبل کار سے نکلے تو سامنے ہی قبرستان تھا۔ سب لوگ ادھر جا رہے تھے۔ ہم بھی چل پڑے۔

دو تین سو فٹ اونچے درخت جن کے تنوں کے قطر چار پانچ فٹ تک تھے، پورے منظر پر چھائے ہوئے تھے۔ ایسے درخت اس سے پہلے میں نے صرف کیلیفورنیا میں دیکھے تھے، وہ بھی صرف تصویروں میں۔

یہ بے ہنگم قبرستان نہیں تھا۔ راہداریاں بنی ہوئی تھیں اور بہت آسانی سے مطلوبہ جگہ پر پہنچا جا سکتا تھا۔ کچی قبر کوئی نہیں تھی، سب کنکریٹ کی بنی ہوئی تھیں۔ اکثر پر تو پتھر بھی لگے ہوئے تھے۔ نام کی تختیاں تو تھیں ہی، بیشتر کے ساتھ مجسمے بھی بنے ہوئے تھے۔ ایک جگہ ایک قبر کے پاس بہت بڑا اکپ بنا نظر آیا۔ اتنا بڑا کہ اس میں آٹھ دس لوگ کھڑے ہو سکتے تھے۔ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔

تھوڑی دیر بعد ہم ستانے کے لئے قبرستان کی مرکزی سڑک کے کنارے لگے بینچ پر بیٹھ گئے۔ اچانک یہ محسوس ہوا کہ کوئی فوجی دستہ پریڈ کرتا آ رہا ہے۔ مگر آواز فوجی بوٹوں کی آواز سے مختلف تھی۔ اس طرف دیکھا تو چالیس پچاس بدھ راہب مارچ کرتے آ رہے تھے۔ ان کے پاؤں میں لکڑی کے سینڈل تھے جن سے مخصوص آواز پیدا ہو رہی تھی۔ سوائے لیڈر کے جو درمیانی عمر کا تھا، سب نوجوان تھے۔ ان میں قدر مشترک اختیاری گنجا ہونا تھا۔ اس کے علاوہ سوائے لیڈر کے سب کا لباس بھی ایک ہی تھا۔ نارنجی رنگ کا لبادہ جس پر سردی سے بچاؤ کے لئے کالی چادر تھی۔ سب نے سفید جرابیں پہنی ہوئی تھیں۔ لیڈر اس طرح ممتاز تھا کہ اس کی چادر بھی نارنجی رنگ کی تھی۔

ان کی پھرتی اور چابکدستی فوجیوں جیسی ہی تھی۔ ایک دو منٹ میں ہی وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

ہم نے اس مرکزی سڑک پر ہی چلتے رہنے کا فیصلہ کیا۔ سڑک کے کنارے پتھر کے مجسموں کی قطار تھی جن کا رخ سڑک کی طرف ہی تھا۔ ان مجسموں کے سامنے پانی کے حوض تھے اور ساتھ ہی لکڑی کے بنے بڑے بڑے چمچ لٹک رہے تھے۔ یہ پانی پینے کے لئے تو نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے ذریعے عقیدت مندان مجسموں پر پانی پھینکتے تھے اور پھر ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔

یہ معمہ ہی رہا کہ وہ عبادت کا یہ انداز کیوں اختیار کرتے تھے۔

●●●

آخرکار ہم قبرستان کی حدود سے نکل آئے۔ نعیم صاحب ہمیشہ ہی اچھے موڈ میں ہوتے ہیں مگر اس دن ان کا موڈ بہت ہی اچھا تھا۔ کبھی گانے گائے جا رہے تھے تو کبھی جگتیں لگائی جا رہی تھیں۔ مسعود صدیقی صاحب حسبِ معمول خاموش تھے اور صرف مسکراہٹ پر ہی اکتفا کر رہے تھے۔

ہمارا خیال تھا کہ کوئی بازار نظر آ جائے گا اور کھانے پینے کے لئے کچھ خرید لیں گے مگر شہر خموشاں سے باہر نکلتے ہی ساری رونق ختم ہو گئی تھی۔

چلتے چلتے ہمیں ایک گراؤنڈ نظر آیا۔ ہم ستانے کے لئے وہاں لیٹ گئے۔ چاروں طرف پہاڑ تھے۔ اچھا منظر تھا۔ یہاں ہلکا پھلکا گلوکاری کا مقابلہ ہوا مگر کب تک۔ اٹھے اور واپسی کی ٹھانی۔

یہ راستہ مختلف اور مختصر تھا۔ اچانک ہمارے سامنے ایک مصنوعی آبشار آ گئی۔ اس میں پانی بہہ رہا تھا مگر قابلِ ذکر چیز یہ تھی کہ اگرچہ دو پہر کے دو بج رہے تھے مگر ابھی تک آبشار کا کچھ حصہ جما ہوا تھا اور گرتا ہوا پانی منجمد حالت میں تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ گزری رات کتنی سرد تھی۔

نعیم کو اٹکھیلیاں سوجھی ہوئی تھیں۔ اس نے آبشار کے جمے پانی کے ساتھ شرارتیں کیں اور بہت ساری تصاویر بنوائیں۔ ساتھ ہی گلوکاری بھی جاری رہی۔

●●●

۹

۱۷اور ۱۸ جنوری ۱۹۹۵عیسوی کی درمیانی رات تھی۔ میں اپنے کمرے میں گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اچانک محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے مجھے بستر سے کئی انچ اوپر اٹھا کر پٹخ دیا ہو۔ میری آنکھیں کھلیں، ذرا حیران ہوا اور پھر سو گیا۔ ایک دفعہ پھر یہ عمل ہوا۔ میں پھر اٹھا، ذرا حیران ہوا اور سو گیا۔ مجھے ذرہ برابر بھی احساس نہیں ہوا کہ یہ زلزلہ ہے اور مجھے فوراً باہر نکل جانا چاہئے۔ سچ ہے نیند بعض صورتوں میں بہت بری چیز ہے۔

وہ تو خیریت گزری کی جاپان میں عمارتیں مضبوط ہوتی ہیں اور زلزلہ سے نسبتاً محفوظ بھی۔ ورنہ اس دن میرا کام تمام ہو جانا تھا۔

صبح اٹھنے تک مجھے گمان تک نہ ہوا کہ کیا قیامت گزر گئی ہے۔ ہاں اتنا ضرور سوچا کہ شاید رات زلزلہ آیا تھا۔ ایسے زلزلے تو جاپان میں آتے ہی رہتے ہیں، کیا پریشان ہونا۔

جب تیار ہو کر یونیورسٹی کی طرف روانہ ہوا تو راستے میں کھڑکیوں کے ٹوٹے ہوئے شیشے نظر آئے۔ شاید ابھی صبح تھی یا زلزلے کا خوف، اکا دکا شخص ہی نظر آ رہا تھا۔ مجھے اتنا تو علم ہو گیا کہ اچھا خاصہ طاقتور زلزلہ آیا ہے۔

جب میں اپنے ڈپارٹمنٹ پہنچا تو صورت حال کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ الماریاں الٹی پڑی تھیں اور کافی نقصان ہوا تھا۔ ہمارے انسٹی ٹیوٹ کی عمارت سات منزلہ تھی۔ اس کی چوتھی اور پانچویں منزلیں بہت متاثر ہوئی تھیں۔ میرا ڈپارٹمنٹ پانچویں منزل پر تھا۔ نیچے اور اوپر والی منزلوں

میں نقصان برائے نام تھا۔

جیسے جیسے لوگ آنا شروع ہوئے، حقائق آشکارا ہونے لگے۔ ایک بہت زبردست زلزلہ آیا تھا، جس نے کوبے میں بڑے پیمانے پر تباہی مچائی تھی۔ اوساکا میں اس کی شدت دس گنا کم تھی۔ اس لئے نقصان بھی نسبتاً بہت کم ہوا تھا۔ خاص طور پر جانی نقصان تو برائے نام ہی تھا۔

یہ زلزلہ صبح پونے چھ بجے آیا تھا اور اسے great Hanshin earthquake یا Kobe earthquake کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ریکٹر سکیل پر اس کی شدت چھ اعشاریہ نو تھی اور یہ بیس سیکنڈ جاری رہا۔

اس زلزلے میں ۶۴۳۴ لوگ ہلاک ہوئے۔ کوبے میں ہلاکتوں کی تعداد ۴۶۰۰ تھی۔ چار لاکھ عمارتوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ لاتعداد سڑکیں اور پل تباہ ہوگئے اور کوبے بندرگاہ بھی تقریباً ساری تباہ ہوگئی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جاپان میں ہر عمارت زلزلہ پروف ہوتی ہے تو اتنا نقصان کیوں ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بالکل مختلف قسم کا زلزلہ تھا جس کی معلوم جاپانی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ عام زلزلے کا مرکز سطح زمین سے کم از کم ساٹھ ستر کلومیٹر گہرائی پر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے اس کے اثرات سینکڑوں کلومیٹر دور تک محسوس ہوتے ہیں مگر تباہی اتنی زیادہ نہیں ہوتی۔ ان زلزلوں میں ارتعاش افقی ہوتا ہے۔ کوبے زلزلے سے پہلے تک جاپان میں تمام عمارتیں افقی زلزلوں سے بچاؤ کے لئے ہی بنائی جاتی تھیں۔

کوبے زلزلے کا مرکز صرف ۲۰ کلومیٹر گہرا تھا۔ اس لئے اس مرکز کے اوپر والے علاقے بالکل تباہ ہوگئے جب کہ کچھ ہی فاصلے پر واقع علاقے محفوظ رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زلزلہ میں ارتعاش عمودی تھا اور عمارتیں اس قسم کے زلزلے سے محفوظ نہیں تھیں۔

اوساکا کا کوبے سے فضائی فاصلہ ۱۸ کلومیٹر ہے اور اوساکا تقریباً محفوظ رہا۔ اوساکا کے جو علاقے کوبے کے نسبتاً قریب تھے وہاں نقصان زیادہ تھا۔ ظفر اقبال صاحب ٹویوناکا (Toyonaka) کیمپس میں رہتے تھے۔ میں ان سے ملنے گیا تو ان کے گھر کے سامنے فٹ بال گراؤنڈ تھا۔ اس کے درمیان میں تقریباً ایک فٹ چوڑی دراڑ پڑی ہوئی تھی۔

زلزلے کے جھٹکوں کے عمودی ہونے کی وجہ ہی سے ہمارے انسٹی ٹیوٹ کی عمارت کی

پہلی تین اور اوپر والی دو منزلیں نسبتاً محفوظ رہیں مگر درمیان والی چوتھی اور پانچویں منزلوں پر بہت نقصان ہوا۔

کوبے میں ایک پانچ منزلہ ہسپتال تھا۔ اس کی تیسری منزل بالکل تباہ ہو گئی۔ لگتا تھا جیسے اوپر والی دو اور نیچے والی دو منزلوں نے آہنی ہاتھوں کی طرح تیسری منزل کو مسل کر رکھ دیا ہو۔ تمام مریض، ڈاکٹر اور نرسیں کچلے گئے اور ہلاک ہو گئے۔

میرے اپنے بستر پر گیند کی طرح اچھلنے کی وجہ بھی یہ عمودی جھٹکے تھے۔

پاکستان کے شمالی علاقوں میں ۲۰۰۵ عیسوی میں جو زلزلہ آیا تھا وہ بھی بالکل اسی نوعیت کا تھا۔ اس میں ساٹھ ستر ہزار لوگ ہلاک ہو گئے۔ بالا کوٹ اور باغ کے علاقے بالکل تباہ ہو گئے مگر پچیس تیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع مانسہرہ محفوظ رہا۔

ہمارے ہاں متاثرہ عمارتیں بہت کمزور تھیں اور زیادہ تر مٹی گارے سے بنی ہوئی تھیں، اس لئے اتنا زیادہ جانی نقصان ہوا۔ دونوں زلزلوں کی شدت تقریباً ایک جیسی ہی تھی۔

کوبے کے زلزلے سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ انسان جتنی بھی ترقی کر لے اور تدبیریں اختیار کرے، ارضی و سماوی آفات کے سامنے بے بس ہے۔

●●●

۱۰

کوبے کے زلزلے نے ہر چیز کو متاثر کیا تھا۔ میرے ڈپارٹمنٹ میں تقریباً ۱۵ دن کام بند رہا۔

کوبے اور گرد و نواح کے ریل کے راستے تعمیر نو کی وجہ سے بند رہے اور میں وہاں نہ جا سکا۔

جب حالات کچھ معمول پر آئے تو میرے واپس پاکستان جانے میں ایک مہینہ ہی رہ گیا تھا۔ میں نے پوری توجہ کام پر مبذول کر دی تا کہ جو پروجیکٹ چل رہے تھے تکمیل تک پہنچ جائیں۔ یہ تو کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ آفت آئے گی اور ماہ ڈیڑھ ماہ ضائع ہو جائے گا۔ اب اس کمی کو پورا کرنا تھا۔

پروفیسر صاحب کی خواہش تو تھی کہ میں اور رک جاؤں مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ اب مجھے واپس جانا ہی تھا۔ میرے اہلِ خانہ میرے منتظر تھے اور NIBGE میں بھی میرا انتظار ہو رہا تھا۔ انہوں نے مجھے دو سال کی چھوٹ دی تھی۔ وہ ہمیشہ تو میرا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔

•••

میرا جاپان کا قیام اللہ تعالیٰ کا خاص انعام تھا۔ پانچ سال کے عرصہ میں مجھے کبھی معمولی نزلہ زکام بھی نہیں ہوا۔ شاید اس کی وجہ آلودگی سے پاک آب و ہوا بھی ہو۔ اس دوران میری علمی ترقی کے ساتھ مجھے معاشی استحکام بھی حاصل ہوا۔

جاپان کے قیام کے دوران نہ صرف میں نے انتہائی ترقی یافتہ اور مہذب قوم کے افراد سے بہت سیکھا بلکہ ایک اچھا سفیر بن کر اپنے ملک کا نام بھی روشن کیا۔

اس کے علاوہ پوری دنیا سے آئے ہوئے لوگوں سے میل جول کا موقع ملا۔ ابھی تک اپنی ہی عینک سے دنیا کو دیکھا تھا۔ پتہ چلا کہ اپنے تمدنی اور مذہبی پس منظر کے مطابق ہر شخص مختلف عینک استعمال کرتا ہے اور اس کے نظریات میں بہت سی چیزیں قابل غور ہوتی ہیں۔

جس جگہ زندگی کے پانچ بہترین سال گزرے ہوں، اس جگہ سے انسیت ہو جانا اور اسے اپنا دوسرا گھر سمجھنا قدرتی بات ہے۔ اس وجہ سے جب میں نے ۲را پریل ۱۹۹۵ عیسوی کو پاکستان واپسی کا سفر شروع کیا تو یقیناً گھر جانے کی خوشی غالب تھی مگر جاپان چھوڑنے کا ملال بھی تھا۔ امید تھی کہ دوبارہ آؤں گا۔ آج کے دور میں یہ مشکل نہیں۔ مگر قدرت کا انتظام دیکھیے کہ وہاں سے آنے کے بعد میں نے دنیا کے بیس سے زیادہ ممالک کا دورہ کیا مگر جاپان جانے کا سبب ابھی تک نہیں بن سکا۔

شاید اس کا ایک سبب تحت الشعور میں چھپا یہ ڈر ہو کہ اس جنتِ گُم گشتہ میں دوبارہ جا کر جب میں وہ ماحول، وہ دوست، وہ جوانی کی بے فکری نہیں پاؤں گا تو یہ بہت تکلیف دہ امر ہو گا۔ بہتر ہے کہ میں اس دور کی یادوں کے ساتھ ہی زندہ رہوں اور اس طلسم کدہ کو موجودہ حقائق کے پتھر مار کر چکنا چور نہ کروں۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب مجھے اس طلسم کدہ میں رہتے رہنے میں بہت مددگار ثابت ہو گی۔

•••

مصنف ڈاکٹر عبدالحق کی پیدائش ۱۹۵۳عیسوی میں لائل پور (فیصل آباد) میں ہوئی۔ میٹرک سے لے کر ایم ایس سی (مائیکروبیالوجی) تک تمام امتحانات فرسٹ ڈویژن میں پاس کئے اور دو یونیورسٹی پوزیشن حاصل کیں۔ اس کے علاوہ TOEFL میں عالمی ریکارڈ ہولڈرز میں شامل ہوئے۔ ایم ایس سی کے بعد پنجاب میڈیکل کالج فیصل آباد میں تدریس شروع کی۔ ۱۹۸۸عیسوی میں کل پاکستان مقابلے میں اول پوزیشن لے کر PhD کے لیے جاپانی حکومت کے وظیفہ کے حقدار ٹھہرے۔ ۱۹۹۱عیسوی میں اوساکا یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد پاکستان واپس آئے۔ ۱۹۹۳عیسوی میں جاپانی پروفیسر نے وظیفہ دلوا کر دوبارہ پوسٹ ڈاکٹریٹ کے لئے بلوایا۔ جاپان سے واپسی پر ۱۹۹۵عیسوی میں ملک کے ممتاز ترین تحقیقی اداروں میں سے ایک نیشنل انسٹیٹیوٹ فار بائیوٹیکنالوجی اینڈ جینیٹک انجینئرنگ (NIBGE) میں سینئر سائنٹسٹ کی حیثیت سے تعینات ہوئے۔ ۲۰۰۱عیسوی میں انہیں بہترین سائنسدان کا اعزاز ملا۔ اسی ادارے سے ۲۰۱۳عیسوی میں ڈپٹی چیف سائنٹسٹ کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اس دوران ان کی نگرانی میں ۱۲ طالب علموں نے PhD اور ۱۷ طالب علموں نے MPhil کیا۔ تحقیقی مقالوں کی تعداد سو کے قریب ہے۔ آج کل دی یونیورسٹی آف فیصل آباد میں پروفیسر آف پتھالوجی اور ڈائریکٹر ایڈوانس سٹڈیز اینڈ ریسرچ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔
اس سے پہلے ان کا حج کا سفرنامہ 'میں حاضر ہوں' اور غیر ملکی سفرناموں کا مجموعہ 'اُڑن کھٹولا' شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ شاعری کی کتاب 'کلام سادہ' بھی چھپ چکی ہے۔

9789695814062

Misaal PUBLISHERS
misaalpb@gmall.com
Ph:+92-41-2643841, Cell:0300-6668284